یہ کتاب انگلستان کے نامور سائنسدان اور عالم ہئیت سر جیمس جینس کی کتاب Through Space And Time کا ترجمہ ہے، اس میں کائنات کی پیدائش، اس کے ارتقار اور نظام کی سرگذشت بیان کی گئی ہے، کتاب آٹھ بابوں پر مشتمل ہے، جس میں زمین، ہوا، آسمان، ماہتاب، سیاروں، سورج، ستاروں اور سدیم کی پیدائش، ان کے ارتقائی مدارج، نظام، طبعی حالات، بے پایان وسعت و عظمت اور محیر العقول عجائبات کو عالمانہ مگر دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس سے ان کی خلقت کی عظمت سے زیادہ خالق کی عظمت و قدرت کا پتہ چلتا ہے، کتاب میں بہت سے دقیق علمی مسائل آگئے ہیں، جنھیں حتی الامکان آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے، مختلف کواکب اور سیاروں کے حالات میں یہ چیز خاص طور سے قابلِ غور ہے، کہ ان کے فطری قوانین اور طبعی حالات، کرۂ ارض کے قوانین و حالات سے بالکل جدا ہیں، اس لئے اگر ان میں زندگی موجود ہو جس کا ابتک کوئی ثبوت نہیں ملا ہے، یا آئندہ کسی زمانہ میں زندگی کا امکان پیدا ہو، تو وہاں کے طبعی و فطری قوانین کے ماتحت وہاں کی مخلوق کی حالت اور اس کی زندگی کرۂ ارض کی زندگی سے اتنی مختلف ہوگی کہ اس کا قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا، ایسی حالت میں کسی دوسرے عالم کے وجود اور وہاں کی مختلف زندگی کو کیوں مشکوک مانا جائے، مباحث کی وضاحت کیلئے جابجا فوٹو بھی دیدیئے گئے ہیں، ترجمہ صاف و سلیس ہے، کتاب مفید ہے، لیکن عام مذاق کی نہیں،

تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت عمر، پتہ:- انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی،

فارسی میں ابو الفتح ضیار الدین محمد المعروف بہ امجد حسین حسینی ایازی کی "تاریخ دکن امجدیہ" دکن کی مشہور تاریخوں میں ہے، برار کے ایک شاعر سہیل نے اس کے چوتھے باب کا جو سلاطین بہمنی کے حالات میں ہے اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا جو غالباً اب تک شائع نہیں ہوا تھا، انجمن ترقی اردو نے پرانی یادگار کی حیثیت سے اسکو شائع کردیا ہے، جناب محمد عبد اللہ صاحب چغتائی کے قلم سے شروع میں ایک مختصر اور مفید مقدمہ ہے،

"م"

"جلد ۵۱" ماہ محرم الحرام ۱۳۶۲ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۳ء "عدد ۲"

مضامین

شذرات

ایک زمانہ تھا کہ رامپور علمائے اعلام کا مرکز تھا، اور خیرآبادی سلسلہ کے تعلق کے سبب سے وہاں کا مدرسۂ عالیہ علوم عقلیہ کی سب سے بڑی درسگاہ تھی، لیکن مولانا فضل حق رامپوری مرحوم کی وفات پر اس کا بھی خاتمہ ہوگیا تھا، اب پیران کہن سال میں وہاں ایک ہی صاحب رہ گئے تھے، یعنی مولانا محمد معز اللہ صاحب مرحوم افسوس کہ ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء کی رات کو انھوں نے بھی رحلت کی، یہ مولوی عبد الحق صاحب خیرآبادی کے آخری شاگرد اور مدرسہ کے پرانے اساتذہ اور بزرگوں کے فیض یافتہ تھے، فقہ میں مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی سے (جو فقہ و اصول میں مولانا شبلی مرحوم کے بھی استاد تھے) اور مولانا حسن شاہ صاحب محدث رامپوری سے بھی استفادہ کیا تھا، سلسلۂ نقشبندیہ اور قادریہ و چشتیہ کے مجاز بھی تھے، رامپور میں مرحوم کا علمی مرتبہ اتنا بلند تھا کہ کسی فتویٰ پر جب تک ان کے دستخط نہ ہوتے وہ عام طور پر مستند نہیں سمجھا جاتا، خاکسار کو دو سال ہوئے کہ مرحوم سے ملاقات کا اور ان کے درس کے سننے کا اتفاق ہوا تھا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے افسوس کہ پچھلے مدرسین اُٹھتے جاتے ہیں اور زمانہ کی نئی آب و ہوا اس تبحر اور مہارت کے نئے مدرسین عربی کی نشوونما سے عاجز ہے،

سنہ ۱۹۴۲ء ختم ہوگیا، مگر دار المصنفین سے اس سال کوئی نئی کتاب شائع نہ ہوسکی، مطبع کا زیادہ تر وقت پرانی ختم شدہ کتابوں کی دوبارہ چھپائی میں لگ گیا، اور جو دو کتابیں زیر طبع تھیں وہ بھی پوری نہ ہوسکیں، ان میں ایک تو تاریخ دولت عثمانیہ تھی جو ۳۰۰ صفحوں تک چھپ چکی ہے، اور اس کا آخری صفحہ مصطفیٰ کمال پاشا کی تحریک تک پہنچ چکا ہے، ہم نے مصنف سے خواہش کی ہے کہ وہ اس جلد کو یہیں تک ختم کردیں، اگر اُن کی تصنیفی مصلحت نے اس کو منظور کرلیا تو یہ جلد فروری میں شائع ہوجائے گی، ورنہ تاخیر ہوگی،

دوسری زیر طبع کتاب حیات شبلی ہے، یہ ساڑھے پانچ سو صفحوں تک چھپ چکی ہے، آیندہ تین سو صفحے باقی ہیں، کوشش ہو رہی ہے کہ اپریل تک یہ چھپ جائے، خیال ہوتا ہے کہ اس میں دار المصنفین، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، دار العلوم ندوہ لکھنؤ اور شبلی اسکول و شبلی کالج اعظم گڈھ کی عمارتوں کے فوٹو ہوں، کہ اب مولانا مرحوم کے مجسم کارنامے دنیا میں یہی ہیں، اگر ان فوٹوؤں کے بلاک اور ان کے چھپنے کا سامان اس زمانہ میں نہ ہوسکا تو یوں ہی سادہ کتاب شائع ہوجائے گی، کہ شبلی کی معنوی حیثیت کو اس ظاہری آرایش کی چنداں ضرورت بھی نہیں

ہمارے یہاں اس وقت دو نئی کتابیں پریس میں جانے کے قابل ہیں، تاریخ بنی عباس یعنی تاریخ اسلام کا تیسرا حصہ، اور الرازی یعنی امام رازی کی حیات اور ان کا فلسفہ، باقی تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کے متعدد حصے تیار ہیں، مگر ابھی ان کی چھپائی اور کاغذ کا انتظام نہیں ہوسکتا، ان کے علاوہ شعر العرب اور تاریخ الحکمار کے ابواب بھی زیر ترتیب ہیں،

رحمت عالم کا ہندی ترجمہ یہیں ہندی ٹائپ میں چھپ رہا ہے، یہ ترجمہ ایک مسلمان نے کیا ہے جس کو ہندی لٹریچر سے پوری آگاہی ہے، اور موجودہ ہندی ادب و انشا کا معیار بھی معلوم ہے، اس لئے اُمید ہے کہ یہ ترجمہ زبان کے اعتبار سے بھی اچھا ہوگا، اور اس لائق ہوگا کہ ہندی ادب میں بھی اس کو جگہ مل سکے

مجلس نظام اسلامی کی طرف سے اسلام کے سیاسی و اقتصادی نظام پر دو کتابوں کے لکھوانے کا جو فیصلہ ہوا تھا، بحمد اللہ کہ اس کی تعمیل ہو رہی ہے، پہلا حصہ سیاسی نظام کا مرتب ہوگیا، اس کا مسودہ صاف ہوکر اس وقت مصنف کے زیر نظر ثانی ہے، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے بھی اس کو دیکھا ہے، اور اس پر اپنے مشورے لکھے ہیں، دوسرا حصہ ۰ صفحوں تک ہوا ہے جس کو کاتب اب صاف کر رہا ہے، باقی حصہ بھی مکمل

ہو کر آجائے تو صاف ہو کر ارکان کی خدمت میں بھیجا جائے،

کتاب کا مرتب ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، کتاب تو سب ہی مرتب کر سکتے ہیں، ضرورت اس کی ہو کہ جو لکھی جائے اس میں خواہ مخواہ اسکی کوشش نہ ہو کہ اسلامی اصولوں کو موجودہ اقتصادی تحریکوں کے اصولوں اور مطالبوں سے ہم آہنگ کرنے کی سعی بیجا کی جائے، اور اس کے لئے آیات قرآنی، احادیث نبوی اور احکام فقہی میں تحریف کی جرأت کی جائے، اس بدعت کی مثالیں وقت کی موجودہ تحریروں، رسالوں اور کتابوں میں جو اس موضوع سے متعلق لکھی جارہی ہیں مل رہی ہیں،

ترکی مدیران اخبار کا وفد ہندوستان آیا ہوا ہے، اس نے لاہور میں یہ کہا کہ وہ پہلے ترک ہیں، پھر مسلمان، عجب نہیں کہ اس بیان پر بہت کچھ مخالف و موافق کہا جائے اور لکھا جائے، لیکن ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ وہ پہلے ہوں یا پیچھے ہوں مگر ہزار پیچھا چھڑانے پر بھی وہ مسلمان ہی ہیں، وہ اس اسلام سے برأت کا اعلان نہ کر سکے، حالانکہ اس اعلان کی آزادی پر اب کسی خوف کا پہرہ نہیں، اس سے ہمارے ان غلام نوجوانوں کو سبق لینا چاہئے، جو سوشلزم کے چند حرف رٹ لینے کے بعد اپنا نام مسلمان قوم کے رجسٹر سے کٹوانے پر فخر کرتے ہیں، ان نوجوانوں کو پیر شیراز کی یہ نصیحت یاد رکھنی چاہئے،

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت ۔ بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

تاہم یہ ترک وفد اگر واقعی اسلام کا نمایندہ ہو کر آتا تو دیکھتا کہ نو کرور مسلمان ان کے استقبال و احترام کا کیا منظر پیش کرتے ہیں، انھوں نے تو اب تک مسلمان اور اسلام کے نام سے حتی الوسع احتراز کیا ہے تاہم جس طرح وہ ہندوستان کے مردہ آثار قدیمہ دیکھنے آئے ہیں، ہم ترکان عثمانیہ کے ان زندہ اور چلتے پھرتے آثار قدیمہ کو دیکھ رہے ہیں، اور اسی پر خوش ہیں،

مرا از زلف او موئے بسند است
(کافی)

مقالات

جامعِ ترمذی

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

ابن حزم کی تنقید امام ترمذی کی علمی جلالت اور جامع ترمذی کی مذکورۂ بالا خصوصیات کے باوجود اس پر بعض محدثین نے تنقید بھی کی ہے، ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز امام ابن حزم کا امام ترمذی کو مجہول لکھنا ہے، لیکن ان کے اس بیان کو بالاتفاق محدثین نے رد کیا ہے، اور اس کو امام ترمذی سے ابن حزم کی ناواقفیت کا نتیجہ قرار دیا ہے، چنانچہ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں:

"حافظ العلم ابو عیسیٰ ترمذی کی ثقاہت متفق علیہ ہے، اور ان کے بارہ میں ابو محمد بن حزم کا یہ قول کہ وہ مجہول ہیں ناقابلِ توجہ ہے، درحقیقت ابن حزم ان سے اور ان کی کتاب جامع اور علل سے واقف ہی نہ تھے"[۱]

حافظ ابن حجر امام ترمذی کے کمالات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:

"ابو محمد بن حزم نے ترمذی کو مجہول لکھ کر اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے، وہ غالباً ترمذی سے واقف ہی نہ تھے، اور نہ ان کو ان کے حفظ اور تصانیف کی خبر تھی، ابن حزم نے اس قسم کے الفاظ بعض اور مشہور ثقات حفاظ مثلاً امام ابوالقاسم بغوی، اسمعیل بن محمد الصفار، اور ابو العباس الاصم وغیرہ کے متعلق بھی استعمال

[۱] میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۱۱

کے ہیں، یہ البتہ تعجب انگیز امر ہے کہ حافظ ابن الفرضی نے اپنی کتاب "المؤتلف والمختلف" میں ترمذی کے رتبہ کے مطابق انکا تذکرہ کیا ہے، اس پر ابن حزم کی نظر کیسے نہیں پڑی[1]

موضوعاتِ ابن جوزی اور جامع ترمذی

اس سلسلہ میں دوسری چیز یہ ہے کہ ابن جوزی نے موضوعات میں ترمذی کی تیئیس (۲۳) روایتوں کو موضوع شمار کیا ہے، لیکن محدثین نے اسے نہیں تسلیم کیا ہے، اس بارہ میں ابن جوزی کا تشدد مشہور ہے، جس طرح حاکم حدیث کی تحسین کرنے میں غیر محتاط ہیں، اسی طرح ابن جوزی موضوع کہہ دینے میں متشدد ہیں، اور ان دونوں کا یہ تشدد و تساہل مشہور ہے، ابن جوزی نے ترمذی کے علاوہ صحاح کی بعض اور کتابوں بلکہ صحیح مسلم تک کی بعض روایات کو موضوع کہہ دیا ہے، محدثین نے ان کے اس تشدد پر بحث کی ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ

"ابن جوزی کی موضوعات میں زیادہ تر موضوع ہی حدیثیں ہیں، اور قابلِ تنقید حدیثوں کے مقابلہ میں ناقابلِ تنقید حدیثیں بہت کم ہیں، پھر بھی اس میں ایک خرابی یہ ہے کہ ابن جوزی بعض اُن حدیثوں کو بھی جو موضوع نہیں ہیں موضوع گمان کر لیتے ہیں، جس طرح حاکم میں یہ نقص ہے کہ وہ غیر صحیح حدیث کو صحیح کہہ دیتے ہیں، ان دونوں کے اس تشدد و تساہل کی وجہ سے ان کی کتابوں سے ماہرِ فن کے علاوہ دوسرا فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس لئے کہ ان کی ہر نقل کردہ حدیث میں اس تساہل اور بے احتیاطی کا امکان رہتا ہے"

حافظ سیوطی نے القول الحسن فی الذب عن السنن میں ثابت کیا ہے کہ ترمذی کی روایتیں موضوع نہیں ہیں[2]

ایک اعتراض و اشکال اور اس کا جواب

امام ترمذی پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے جامع ترمذی کی روایات کی تحسین و تصحیح میں تساہل سے کام لیا ہے، اور وہ ایک ہی حدیث کو حسن صحیح، حسن غریب اور حسن صحیح غریب تک کہہ دیتے ہیں، حالانکہ کسی ایک حدیث میں ایک ساتھ ان تینوں اوصاف یا ان میں

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۸ [2] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۸۱،

سے کسی دو کا اجتماع نہیں ہو سکتا، محدثین نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں،

درحقیقت یہ اعتراض اور اشکال اس لئے پیش آتا ہے کہ حدیث حسن صحیح اور غریب کے ایک متعین معنی ایک خاص تعریف اور ایک قسم کو معیار قرار دیکر اس پر ترمذی کے حسن صحیح اور غریب کو منطبق کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے، اگر ان حدیثوں کے جملہ مراتب و درجات، ان کے اقسام، ان کی مختلف نوعیتوں اور اس بارہ میں محدثین کے اختلافات کو پیش نظر رکھا جائے، تو یہ اشکال پیدا نہیں ہو سکتا، اولاً ترمذی خود مجتہد تھے، انھوں نے ان اصطلاحوں کے مروجہ معنی کو بجنسہٖ قبول نہیں کیا تھا، بلکہ ان کی بعض اصطلاحوں کا مفہوم عام اصطلاحوں سے مختلف تھا، مثلاً حسن کی مشہور تعریف یہ ہے کہ جس کا مخرج معلوم ہو، اور اس کے رجال مشہور ہوں[1]، لیکن ترمذی کے نزدیک حسن وہ ہے جس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور روایت شاذ نہ ہو[2]، اور جیسا کہ شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے مقدمہ شرحِ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ یہ بھی حسن کی محض ایک قسم کی تعریف ہے[3]، نیز امام ترمذی نے خود اس کی تصریح کر دی ہے، کہ جس حدیث کو انھوں نے حسن کہا ہے اس سے عام محدثین کی اصطلاح نہیں بلکہ ان کا حسن مراد ہے[4]،

اسی طریقہ سے حدیث کی صحت کے بہت سے مدارج اور اس کی مختلف نوعیتیں ہیں، اور اس کے لحاظ سے صحیح کی بہت سی قسمیں ہو جاتی ہیں، ابن صلاح لکھتے ہیں کہ "حدیث صحیح وہ ہے جس کی سند شروع سے آخر تک مسلسل ہو، اس کے تمام راوی عادل و ضابط ہوں اور روایت شاذ و معلل نہ ہو، ایسی حدیث بالاتفاق تمام محدثین کے نزدیک صحیح ہے یعنی یہ صحت کا اعلیٰ درجہ ہے، پھر کسی حدیث میں ان اوصاف کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کے اختلاف کی بنا پر یا صحت کے لئے کسی امام یا محدث کے نزدیک ان شرائط میں سے کسی شرط کے ضروری نہ ہونے کی بنا پر اس حدیث کی صحت و عدم صحت میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، جیسے مرسل حدیث جن ائمہ کے نزدیک حجت ہے، ان کے نزدیک وہ حدیث صحیح میں شامل ہے، اور جن کے نزدیک

[1] مقدمہ ابن صلاح ص ۱۳ [2] کتاب العلل ص ۶۵۳ مطبع العلوم دہلی [3] تحفۃ الاحوذی ص۔ [4] کتاب العلل ص ۶۵۳

حجت نہیں ہے، ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے، پھر جب محدثین کسی حدیث کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے نزدیک صحت کے شرائط اس میں موجود ہیں، یہ ضروری نہیں ہے کہ واقع میں بھی ایسا ہی ہو، .... اسی طریقہ سے جب کسی حدیث کے متعلق محدثین یہ کہتے ہیں کہ وہ صحیح نہیں ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ جھوٹی ہے، کیونکہ ایسی بعض حدیثیں بھی درحقیقت سچی ہوتی ہیں، بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کی سند ان کے نزدیک صحت کے شرائط کے مطابق ہے، ...... پھر صحیح حدیث کی دو قسمیں ہیں، متفق علیہ اور مختلف فیہ پھر اس کی قسمیں مشہور اور غریب ہیں، پھر کسی حدیث میں صحت کے شرائط کے تمکن کے لحاظ سے صحت کے درجات میں فرق پیدا ہوجاتا ہے، (یعنی جس کمال کے ساتھ یہ شرائط پائے جائیں گے اسی قدر صحت کا درجہ بڑھ جائے گا، اور اس میں جتنی کمی ہوگی اسی اعتبار سے صحت میں فرق پیدا ہوجائے گا، اس لحاظ سے صحیح حدیث کی بیشمار قسمیں ہوجاتی ہیں[1]

اسی طرح صحیح اور حسن کی دو قسمیں ہیں، صحیح لذاتہ اور حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ اور حسن لغیرہ، صحیح لذاتہ اور حسن لذاتہ کی تعریف تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی، صحیح لغیرہ وہ ہے جس میں صحیح لذاتہ کے تمام شرائط تو نہ پائے جاتے ہوں لیکن کثرت طرق نے اس کمی کو پوری کردیا ہو، حسن لغیرہ وہ حدیث ہے جس میں ضعف ہو لیکن تعدد طرق نے اس ضعف کو دور کردیا ہو،

اسی طرح سے غرابت کی دو قسمیں ہیں، متن کی غرابت اور سند کی غرابت، یعنی سند میں کوئی راوی منفرد ہوگیا ہو، یا کسی حدیث کے اصل متن میں عام روایات کے خلاف کوئی جزوی کمی یا زیادتی یا تغیر ہو، ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنے کے بعد حسن صحیح اور غریب کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا، مثلاً ایک ہی حدیث میں ایک محدث کے نزدیک حسن یا صحیح کے جملہ شرائط پائے جاتے ہیں، اس لئے اس کے نزدیک وہ حسن یا صحیح ہوگی، اور دوسرے کے نزدیک نہیں پائے جاتے اس لئے اس کے نزدیک نہ

[1] مقدمہ ابن صلاح ص۶

حسن ہوگی نہ صحیح یا ایک کے نزدیک حسن کی شرائط پائے جاتے ہیں، دوسرے کے نزدیک صحیح کے، اس لئے ایک کے نزدیک حسن ہوگی دوسرے کے نزدیک صحیح ہوگی،

اسی طریقہ سے ایک ہی حدیث ایک کے نزدیک حسن ہوسکتی ہے اور دوسرے کے نزدیک صحیح جس کو امام ترمذی نے حسن صحیح سے تعبیر کیا ہے، بلکہ ایک شخص کے نزدیک ایک ہی حدیث حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ ہوسکتی ہے، یا ایک حدیث دو سندوں سے مروی ہے، ایک سند کے اعتبار سے حسن ہے، دوسری متن کے اعتبار سے صحیح پھر صحیح کے بہت سے مدارج ہیں، ان مدارج کے اعتبار سے صحیح کے ادنی درجہ کا اجتماع حسن کے اعلی درجہ کے ساتھ ہوسکتا ہے اور اس لحاظ سے کہ صحیح کے اعلی شرائط کے تحت میں حسن کے ادنی شرائط خود بخود آجاتے ہیں، ہر صحیح حدیث حسن کہی جاسکتی ہے، اور متقدمین کے یہاں صحیح حدیث پر حسن کا اطلاق ملتا ہے، اس کے علاوہ حسن اور صحیح کے اجتماع کی محدثین نے اور صورتیں بھی نقل کی ہیں،

اسی طریقہ سے غرابت اور حسن میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے، ممکن ہے ایک حدیث سند کے اعتبار سے غریب ہو اور متن کے اعتبار سے حسن، اور ترمذی کی مراد یہی ہے، اسی طریقہ سے صحت اور غرابت کا اجتماع بھی ہوسکتا ہے، شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے مقدمہ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ صحت اور غرابت کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں ہے (تحفۃ الاحوذی بحوالہ مقدمہ مشکوٰۃ، ص۲۰۰)

غرض صحیح حسن اور غریب کے جملہ اقسام و مدارج اور اختلاف کو پیش نظر رکھنے کے بعد ان کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا، اسی سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ترمذی نے حدیثوں کی تحسین و تصحیح میں بھی تساہل سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ وہ کسی نہ کسی پہلو سے حسن و صحیح ہوتی ہے،

یوں تو کتاب اللہ کے علاوہ کسی کتاب کے متعلق قطعی صحت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا، بخاری و مسلم تک خوردہ گیری سے محفوظ نہیں ہیں، ایسی حالت میں ترمذی کیوں محفوظ رہتی، لیکن مجموعی حیثیت سے سلف سے لیکر خلف تک، اس کی صحت مسلم چلی آتی ہے، جس کا ثبوت صحاح ستہ میں اس کا شمار

ہے، پھر صحاح میں بھی صحیحین کے بعد ہی اس کو جگہ ملی، ملا کاتب چلپی لکھتے ہیں "ہو ثالث الکتب الستۃ فی الحدیث"[1] اور ائمہ حدیث اسکو احادیث حسن کی بنیاد قرار دیتے ہیں، ابن صلاح لکھتے ہیں "کتاب ابی عیسیٰ اصل فی معرفۃ الحدیث الحسن"[2]

ترمذی کے متعلق اوپر بہت سے اکابر علماء و محدثین کی رائیں گذر چکی ہیں، یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں، خود ترمذی کے زمانہ میں عراق، خراسان اور حجاز کے علماء محدثین سے اسکو حسن قبول کی سند مل چکی ہے، امام ترمذی کا بیان ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے بعد میں نے اسکو حجاز، عراق اور خراسان کے علماء کے سامنے اظہار رائے کیلئے پیش کیا، ان سبنے اسکو پسند کیا، اور اہل نظر نے اسکو یہ سند عطا کی کہ من کان فی بیتہ ھذا الکتاب فکانما فی بیتہ نبی یتکلم یعنی جس کے گھر میں یہ کتاب موجود ہو اسکے گھر میں گویا نبی بول رہا ہے[3]، اہل علم شعرا نے اسکی تعریف میں قصائد لکھے ہیں، شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے بستان المحدثین اور حطہ میں یہ قصائد نقل کئے ہیں[4]،

شروح ترمذی ترمذی کی اہمیت اور اس کی فائدہ رسانی کی وجہ سے علماء و محدثین نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا، اس کی شرحیں لکھیں، حواشی لکھے، مختصرات مرتب کئے، اس کے مشکلات حل کئے، اور اس کے مختلف پہلوؤں پر معلومات کا بیش قیمت ذخیرہ فراہم کر دیا،

صاحب کشف الظنون نے اس کی آٹھ شرحوں کا ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) سب سے پہلی اور قدیم شرح حافظ ابوبکر محمد بن عبد اللہ شبیلی المعروف بہ ابن العربی المتوفی ۵۴۶ھ کی عارضۃ الاحوذی ہے، شاہ عبد العزیز صاحب نے بستان المحدثین میں اس کا مستقل تذکرہ کیا ہے[5]، اس کا ایک حصہ مجموعہ شروح اربعہ کے ساتھ چھپ گیا ہے[6]، اور کامل قلمی نسخہ مدینہ منورہ کے کتبخانہ میں موجود ہے،

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۳۳۲ [2] مقدمہ ابن صلاح ص ۱۳ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۳ [4] حطہ ص ۱۰۲ و بستان المحدثین ص ۱۲۲

[5] بستان المحدثین ص ۱۱ [6] نواب محمد علی خان مرحوم والی ٹونک کے فرزند نواب زادہ محمد عبد الوہاب خان صاحب نے ترمذی کی چار شرحوں عارضۃ الاحوذی، قوت المغتذی سیوطی اور ابو طیب سندھی اور سراج احمد سرہندی کی شرحوں کو مجموعہ شروح اربعہ کے نام سے چھپوایا تھا لیکن غالباً اسکی ایک ہی جلد چھپ سکی،

(۲) دوسری حافظ ابو الفتح محمد بن محمد بن سید الناس یعمری شافعی المتوفی ۷۳۴ھ کی شرح یہ بڑی ضخیم ہے، شارح نے اس میں حدیث کے علاوہ اور بھی بہت سے مباحث شامل کر دئے ہیں، دو ثلث کی شرح دس جلدوں میں آئی ہے، اور مصنف کے قلم سے تمام نہ ہو سکی، ان کے بعد حافظ زین الدین عبد الرحیم ابن حسین العراقی المتوفی ۸۰۶ھ نے پوری کی، اس کا مکمل نسخہ بھی مدینہ منورہ کے کتب خانے میں ہے[1]،

(۳) تیسری صحیحین اور ابوداؤد پر ترمذی کے زوائد کی، سراج الدین عمر بن علی الملقن المتوفی ۸۰۴ھ کی شرح،

(۴) چوتھی سراج الدین عمر بن رسلان بلقینی شافعی المتوفی ۸۰۵ھ کی شرح العرف الشذی یہ بھی تمام نہ ہو سکی، صرف ایک ٹکڑے کی شرح ہے،

(۵) پانچویں حافظ زین الدین عبد الرحمن بن احمد بن نقیب حنبلی المتوفی [illegible]ھ کی شرح یہ بیس (۲۰) جلدوں میں تھی، کسی ہنگامے میں ضائع ہو گئی، اب اس کا صرف نام کتابوں میں ملتا ہے،

(۶) چھٹی حافظ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی شرح القوت المغتذی، اس کا ایک حصہ شروح اربعہ کے ساتھ چھپا ہے،

(۷) ساتویں حافظ زین الدین عبد الرحمن بن احمد بن رجب حنبلی المتوفی ۷۹۵ھ کی شرح اسکا اور کچھ حال نہیں معلوم،

(۸) آٹھویں شیخ ابو الحسن محمد بن عبد الہادی سندھی مدنی المتوفی ۱۱۳۹ھ کی شرح، شیخ مذکور نے اس کو مدینہ طیبہ میں لکھا تھا، کشف الظنون نے اسے بڑی لطیف شرح لکھا ہے[1]،

ملا کاتب چلپی نے صرف ان آٹھ شروح کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کے علاوہ اور شرحیں بھی ہیں مثلاً

(۹) نویں شیخ سراج احمد سرہندی کی فارسی شرح اسکا بھی ایک حصہ شروح اربعہ میں چھپا ہے،

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۳۴۷

(۱۰) دسویں حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کی اللباب فی مایقول الترمذی فی الباب، امام
ترمذی نے فی الباب عن فلاں کہہ کر جن روایتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اس میں اس کی تفصیل [illegible]
جرح وتعدیل ہے، اس کا نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود ہے،

(۱۱) گیارہویں ابوطیب سندھی المتوفی ۱۱۰۹ھ کی شرح، یہ بھی شروح اربعہ میں ہے،

(۱۲) بارہویں حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اپنی ایک شرح کا حوالہ دیا ہے،

(۱۳) تیرہویں مولانا شمس الحق مرحوم عظیم آبادی کی ہدایۃ اللوذعی بنکات الترمذی،

(۱۴) چودھویں الکوکب الدری مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، یہ جامع ترمذی پر مولانا
کے افادات ہیں، جسے مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی مرحوم نے مرتب کیا تھا، اور مولانا محمد زکریا [illegible]
شیخ الحدیث مظاہر العلوم نے شائع کیا ہے،

(۱۵) پندرہویں العرف الشذی کے نام سے مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری کے افاد[illegible]
کو ان کے ایک شاگرد نے جمع کیا ہے،

(۱۶) سولہویں مولانا عبدالرحمن مرحوم مبارکپوری مرحوم کی التحفۃ الاحوذی یہ چھپ گئی ہے، اس [illegible]
مقدمہ خاص طور سے اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے، کاتب سطور نے اس مضمون میں اس سے استفادہ کیا ہے،

(۱۷) مولانا اصغر حسین صاحب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے حنفی نقطۂ نظر سے طلبہ کے استفادہ کیلئے نزول [illegible]
کے نام سے ترمذی کی احادیث کے متعلق مختلف قسم کے سوالات اور ان کے جوابات لکھے ہیں [illegible]
ایک حصہ چھپ گیا ہے،

مختصرات ترمذی | شرحوں کے علاوہ ترمذی کے مختصرات بھی کئے گئے، کشف الظنون میں تین مختصروں کا [illegible]
لکھا ہے، ایک نجم الدین محمد بن عقیل البالسی شافعی المتوفی ۷۲۹ھ کا، دوسرا نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی [illegible]
حنبلی المتوفی ۷۱۰ھ کا، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے،[۵] اسی سے حافظ صلاح الد[illegible]

۵ فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج اول ص ۲۱۱

خلیل بن کیکلدی علائی نے ترمذی کی سو حدیثوں کا انتخاب کیا ہے،

تجرید ترمذی | ابوالفضل محمد تاج الدین بن عبدالمحسن المعروف بقلعی نے ترمذی کی تجرید بھی کی، اس کا قلمی
نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ہے،[۵]

حواشی | ان مستقل کتابوں کے علاوہ ترمذی پر بہت سے حواشی لکھے گئے، ہندوستان کی مطبوعہ ترمذی
میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کا حاشیہ زیادہ شائع ہے،

شمائل ترمذی | اس مضمون کا اصل مقصد جامع ترمذی پر تبصرہ تھا، اور امام ترمذی کی باقی دونوں کتابیں
یعنی شمائل اور کتاب العلل موضوع سے خارج ہیں، لیکن شمائل نبوی کی اہمیت کی وجہ سے اس کا بھی
مختصر تذکرہ مناسب معلوم ہوا،

جس طرح آنحضرت صلعم کے ارشادات گرامی مسلمانوں کے لئے واجب العمل ہیں، اسی طرح
آپ کے اخلاق مبارک، اعمال، طور طریقے، طبعی امور، آپ کی زندگی کا ہر پہلو اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے،
اس کے حالات ضمناً جستہ جستہ حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں، لیکن امام ترمذی سے پہلے خاص اس موضوع
پر کوئی مستقل کتاب نہ تھی، یہ سعادت سب سے پہلے امام ترمذی کے حصہ میں آئی، اور آنحضرت صلعم کے حلیہ
مبارک، لباس، ساز وسامان، عادات وخصائل، رفتار وگفتار، نشست وبرخاست، اخلاق اور معمولات
کے متعلق جتنی روایتیں امام ترمذی کو پہنچیں انھوں نے اس کو شمائل میں جمع کر دیا ہے، گو یہ کتاب
مختصر ہے، لیکن ایسی جامع ہے کہ اس میں اخلاق نبوی کا پورا مرقع نظر آجاتا ہے، شمائل ترمذی کے بعد
اس موضوع پر اور کتابیں لکھی گئیں، لیکن اولیت کا سہرا امام ترمذی کے سر رہا، کشف الظنون میں شمائل ترمذی
کے علاوہ دو اور کتابوں کا نام ملتا ہے، ایک ابوالعباس جعفر بن محمد المستغفری المتوفی ۴۳۲ھ کی
"شمائل النبی" دوسری ابوالحسن علی بن محمد بن ابراہیم فزاری المعروف بابن المقری غرناطی المتوفی ۵۵۲ھ

۵ فہرست کتب خانہ خدیویہ ج اول ص ۲۷۹

کی "شمائل بالنور الساطع الکامل"[1] اس کے علاوہ ایک اور کتاب "شمائل محمدی" شیخ عبدالرسول بن عبدالصمد کی ہے[2] لیکن جو حسنِ قبول شمائل کو حاصل ہوا وہ کسی کے حصہ میں نہ آیا، اس کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ جامع ترمذی کی طرح علماء و محدثین نے اسکی بھی بہت سی شرحیں اور حواشی لکھے، بعض شرحوں اور ان کے شارحین کے نام یہ ہیں:

(۱) **اشرف الوسائل فی شرح الشمائل** حافظ ابن حجر مکی المتوفی ۹۷۳ھ یہ شرح حرم محترم میں رمضان کے مقدس مہینے میں لکھی گئی تھی،[3]

(۲) **شرح شمائل** مصلح الدین محمد بن صلاح بن جلال اللاری المتوفی ۹۷۹ھ یہ شرح عربی میں ہے[4] اس کے علاوہ انھوں نے فارسی میں بھی ایک شرح لکھی ہے،

(۳) **زہر الخمائل علی الشمائل** حافظ جلال الدین سیوطی،

(۴) **جمع الوسائل** نور الدین علی بن سلطان محمد القاری المعروف بہ ملا علی قاری المتوفی ۱۰۱۴ھ، شیخ محمد بن عمر بن حمزہ انطاکی نے تہذیب الشمائل کے نام سے اس کی تہذیب کرکے اس کو سلطان بایزید کی خدمت میں پیش کیا تھا،[5] یہ شرح قسطنطنیہ میں ۱۲۹۰ھ میں چھپ چکی ہے،

(۵) **شرح شمائل** مولانا عصام الدین ابراہیم بن محمد اسفراینی المتوفی ۹۴۳ھ،[6]

(۶) **شرح شمائل** مولی محمد حنفی یہ شرح ۹۲۶ھ میں لکھی گئی،[7]

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۶۲ [2] فہرست رامپور ص ۹۳ [3] اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ اور کتب خانہ رامپور میں موجود ہے فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۵ ص ۳۰۶ و فہرست کتب عربی کتب خانہ رامپور ص ۹۶ [4] کشف الظنون ج ۲ ص ۶۲ اس کا قلمی نسخہ مصر کے شاہی کتب خانہ میں ہے، ملاحظہ ہو فہرست کتب عربی کتب خانہ خدیویہ ج اول ص ۳۲۲ [5] اس کا قلمی نسخہ مصر اور پٹنہ لائبریری میں ہے، فہرست کتب خانہ خدیویہ ج اول ص ۳۲۲ و مفتاح کنوز الخفیہ ج اول ص ۲۰۱ [6] اس کا قلمی نسخہ پٹنہ اور رامپور کے کتب خانوں میں ہے، مفتاح کنوز الخفیہ ج اول ص ۲۰۱ و فہرست رامپور ج اول ص ۹۰،

(۷) **شرح شمائل** حافظ زین الدین محمد المعروف بعبد الرؤف بن تاج العارفین مناوی المتوفی ۱۰۳۱ھ، یہ شرح مولانا عصام الدین اسفرائنی اور ابن حجر مکی کی شرحوں کا خلاصہ ہے، اور کچھ مزید اضافے بھی ہیں، خواجہ اسحاق آفندی المتوفی ۱۱۲۰ھ نے ترکی میں اس کا ترجمہ کیا اور مصطفی بن حسین حلبی المعروف بہ منظوم زادہ نے اسے ترکی میں نظم کیا،[1] یہ شرح مصر اور قسطنطنیہ کے مطبعوں سے شائع ہو چکی ہے (معجم المطبوعات کالم ۱۷۹۹)

کشف الظنون میں صرف ان شرحوں کا تذکرہ ہے لیکن انکے علاوہ بھی بعض شرحیں ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۸) **الفوائد الجلیلۃ البہیہ،** شیخ محمد بن قاسم بن محمد احمد بن جسوس شارح بارہویں صدی کے آخر کے ممتاز علماء میں تھے،[2] یہ مطبع بولاق میں ۱۲۹۶ھ میں چھپ گئی ہے،

(۹) **مواہب محمدیہ** شیخ سلیمان بن منصور عجیلی شافعی المتوفی ۱۲۰۴ھ، اس کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ اور پٹنہ لائبریری میں ہیں،[3]

(۱۰) **شرح شمائل** شاہ میرک بخاری،[4]

(۱۱) اس فخر و فضیلت سے ہندوستان بھی محروم نہ رہا اور یہ سعادت و شرف بھی اسی خاندان کے حصہ میں آیا جس کے فیض سے ہندوستان میں حدیث کا سرچشمہ جاری ہوا یعنی شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خلف الصدق مولانا نور الحق شارح بخاری مسلم نے شمائل ترمذی کی بھی ایک شرح لکھی، اس کا قلمی نسخہ کتب خانۂ رامپور میں ہے،[5]

(۱۲) شرح حسن آفندی ۱۲۵۲ھ میں بولاق میں چھپی ہے (معجم المطبوعات کالم ۷۵۵)

(۱۳) خصائل نبوی ترجمہ اردو شمائل ترمذی مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم ترجمہ

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۶۲ اس کے قلمی نسخے مصر اور پٹنہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، ملاحظہ ہو فہرست مصر ج اول ص ۳۶۶ و مفتاح الکنوز الخفیہ ج اول ص ۲۰۱ [2] فہرست کتبخانہ مصر ج اول ص ۳۶۲ [3] ایضاً ص ۳۶۴ و مفتاح الکنوز ج ۲ ص ۵۳ [4] مفتاح الکنوز ج اول ص ۲۰۱ [5] فہرست رام پور ص ۹۰

کے ساتھ احادیث کے متعلق مختلف قسم کے مفید معلومات اور مشکلات کا حل بھی ہے، یہ ترجمہ چھپ گیا ہے،

شرحوں کے علاوہ شمائل کے متعدد حواشی بھی لکھے گئے، دو مشہور حواشی اور محشی کے نام یہ ہیں،

۱۔ مواہب الدینیہ شیخ ابراہیم بن محمد باجوری المتوفی ۱۲۷۶ھ یہ حاشیہ سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہوا، اور عام طور سے متداول ہے،

(۲) حاشیہ ابو الضیاء نور الدین علی بن علی شبراملسی شافعی المتوفی ۱۰۸۷ھ یہ حاشیہ شمائل اور ابن حجر کی شرح شمائل دونوں پر ہے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ہے،[1]

کتاب العلل | امام ترمذی کی تیسری کتاب کتاب العلل ہے، یہ علل حدیث پر ایک مختصر لیکن مفید رسالہ ہے، حدیث کی صحت اور اس کے اسقام کی جانچ کے لئے جرح و تعدیل کے اصول و قواعد اور مستقل فنون ہیں، لیکن بعض حدیثوں میں ایسے مخفی عیوب ہوتے ہیں، جنکا علم ان اصولوں اور فنون سے نہیں ہوتا اور ایک روایت اصول و قواعد کے اعتبار سے بالکل صحیح ہوتی ہے، لیکن اس میں کوئی ایسی مخفی علت ہوتی ہے جسکا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا، اس کے لئے حدیث پر بڑی وسیع اور دقیق نظر کی ضرورت ہے، ان عیوب کے معلوم کرنے کیلئے علل الحدیث ہے، حاکم لکھتے ہیں،

علوم حدیث میں ایک علم حدیث کی علتوں کے جاننے کا علم ہے، یہ صحیح سقیم اور جرح و تعدیل کے علاوہ ایک مستقل علم ہے...... حدیث مختلف وجوہ سے معلل ہو جاتی ہے جس میں جرح و تعدیل کو کوئی دخل نہیں ہوتا، اس لئے کہ مجروح حدیث تو سرے سے ساقط اور ناقابل اعتبار ہے، اکثر ثقات کی حدیثوں میں ایسی علت ہوتی ہے جو ان کی نظر سے مخفی رہتی ہے اور حدیث معلل ہو جاتی ہے، اس کے علم کا ذریعہ صرف حفظ فہم اور معرفت حدیث ہے،[2]

حاکم نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں، یہ ایسا دقیق علم ہے کہ اس کے لئے بڑی وسعت و دقت نظر

---

[1] فہرست عربی کتب خانہ خدیویہ ج۱ ص۲۳۳ ، [2] معرفۃ علوم الحدیث حاکم ص۱۱۲

کی ضرورت ہے، اس لئے بہت کم محدثین نے علل حدیث پر لکھا ہے جن لوگوں نے لکھنے کی ہمت کی ان میں ایک امام ترمذی ہیں، ان کا یہ رسالہ جامع ترمذی کے آخر میں لگا ہوا ہے،

امام ترمذی کا مذہب | امام ترمذی کا زمانہ ائمۂ اربعہ کے بعد ہے، لیکن وہ ان میں سے کسی کے مقلد نہ تھے، بلکہ خود مجتہد تھے، بعض مسائل میں امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کی تائید سے بعضوں کو یہ گمان ہوا کہ وہ شافعی یا حنبلی تھے، لیکن اس سے ان کی تقلید کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے، انھوں نے بعض مسائل میں انکی مخالفت بھی کی ہے، مثلاً گرمی کی شدت میں نماز ظہر کی تاخیر کے مسئلہ میں انکی رائے امام شافعی کے خلاف ہے وہ اپنی تحقیق سے جو رائے دیتے تھے وہ کبھی کسی امام کے موافق پڑ جاتی تھی اور کبھی مخالف، اس لئے کسی مسئلہ میں کسی امام کی تائید سے ان کو اس کا مقلد سمجھنا صحیح نہیں ہے،

ایک التباس کا ازالہ | امام ابو عیسیٰ ترمذی کے علاوہ دو اور محدثین ترمذی کی نسبت سے مشہور ہیں، ایک ابو عبد اللہ محمد بن علی المعروف بحکیم الترمذی، دوسرے ابو الحسن احمد بن حسن ترمذی یہ دونوں صاحب تصنیف ہیں، حدیث میں حکیم ترمذی کی نوادر الاصول مشہور کتاب ہے، لیکن یہ بہت غیر معتبر ہے اس لئے نام سے دھوکا نہ کھانا چاہئے، شاہ عبد العزیز صاحب لکھتے ہیں،

حکیم ترمذی ابو عیسیٰ ترمذی کے علاوہ دوسرے شخص ہیں، حکیم ترمذی کی نوادر الاصول کی اکثر حدیثیں غیر معتبر ہیں، ناواقف حکیم ترمذی کو ابو عیسیٰ ترمذی سمجھ کر ان کی غیر معتبر حدیثیں، امام ترمذی کی جانب منسوب کر دیتے ہیں ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے،[1] ابو الحسن ترمذی البتہ بڑے پایہ کے محدث ہیں، امام احمد بن حنبل کے اصحاب میں تھے، بخاری ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ نے ان سے روایتیں کی ہیں ۲۴ھ میں وفات پائی[2]

---

[1] بستان المحدثین ص۷۵ ، [2] تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۱۱

"شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک"

(استدراک و تنقیح)

از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کیٹلاگر اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ

"مضمون ذیل میں ایک عزیز نے مولانا عبید اللہ صاحب سندھی کی کتاب شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک تن مع شرح پر ایک تبصرہ لکھا ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ مولانا موصوف حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف و رسائل پر بہت عمیق نظر رکھتے ہیں اور اس سے زیادہ یہ کہ شاہ صاحب کے متفرق مسائل کو اُنھوں نے اپنے خیالات اور نظریوں کے مطابق اس طرح منظم کر لیا ہو کہ گویا شاہ صاحب کا مخصوص فلسفہ تیار ہو گیا ہے، یہ بحث دوسری ہو کہ شاہ صاحب کے ایک فقرہ سے کہیں پورا باب اور کہیں شاہ صاحب کے پورے باب سے صرف ایک فقرہ لے لیا گیا ہے، اور اس طرح حسب خواہش فلسفہ تیار ہو گیا ہے،

بہر حال مولانا اگر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پورے فلسفہ کو جس کو اُنھوں نے اپنے ذہن میں ترتیب دے لیا ہے، کاغذ کے صفحوں میں ترتیب دیدیں، تو یہ ایک بڑا کام ہو گا، اس سے ایک فائدہ جہاں یہ پہنچے گا کہ حضرت شاہ صاحب کے علوم منظم ہو کر ناظرین کے سامنے آجائیں گے، وہاں یہ فائدہ بھی حاصل ہو گا کہ خود مولانا سندھی اور اُن کے پورے مدعا کے سمجھنے میں بڑی آسانی ہو جائیگی، ورنہ پوری داستان کا یوں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پھیلنا بات کو اپنی جگہ سے ہٹا دینا اور مقاصد کا منتشر کر دینا ہے

معارف میں اس کتاب پر جو مختصر تبصرہ شائع ہوا تھا، اس کے جواب میں مولانا سندھی کا کرمت نامہ آیا ہے، اس سے بھی یہ بات ظاہر ہوئی ہو کہ موصوف کے خیالات جو لوگ شائع کر رہے ہیں، وہ ادھ کٹی صورت میں ہیں اور اس طریق اشاعت سے بہت سے گوشے ناتمام رہ جاتے ہیں اور مصنف بہت سے جھوٹے سچے الزامات کا نشانہ بن جاتا ہے،

مولانا سندھی کے نزدیک سید شہیدؒ کی تحریک کی ناکامی کا سبب یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اس میں شوکانیت اور وہابیت، یا صریح لفظ کہئے کہ غیر مقلدیت کی آمیزش ہو گئی تھی، اور غالباً اس موجودہ رد و قدح کا مرکز بھی یہی خیال ہے، مگر جہاں تک خاکسار کے علم کا تعلق ہو، اس تحریک کے علمبرداروں میں فقہی جنگ وجدال یا آمین اور رفع یدین کے ذریعہ، رد بدعت یا اتباع سنت کا خیال کبھی راہ نہیں پایا، سید شہیدؒ، مولانا شہیدؒ اور دوسرے وابستگانِ دامن کی تحریر و تقریر و مناظرہ اور خطوط و مکاتیب وغیرہ موجود ہیں، اُن سے استناد کرنا چاہئے، تحریک کا مقصود عقائد کی صحیح اصلاحی، اعمال کی اصلاح، توحید کی اشاعت، باطل کا رد اور رسومِ فاسدہ کا ازالہ اور احکامِ اسلام کا اجرار تھا، باقی حکایات و روایات احاد اس باب میں سند کے قابل نہیں، خواہ کسی جانب سے ہوں، البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس تحریک نے اتباع سنت کا جو جذبہ پیدا کر دیا تھا، اس کے اثر سے کچھ لوگوں کو موجودہ کتب احادیث کے دفتر میں جو چیز اول وہلہ میں سنت ثابت ہوتی نظر آئی ہے، اسکے قبول کر لینے میں کوئی تقلیدی خیال ان کو باز نہ رکھ سکا، سرسید کے ایک خط سے جو مولانا ابراہیم صاحب آروی شاگرد رشید مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کے نام ہے، یہ ظاہر ہوتا ہو کہ مولانا نذیر حسین صاحب نے آمین بالجہر اور رفع یدین پر عمل سرسید کی حوصلہ افزائی سے شروع کیا،

مولانا ابو الکلام کے والد ماجد جو اس تحریک کے شدید مخالفین میں تھے، اس کو بنی اسرائیل کی طرح دو سلسلوں میں منقسم کرتے تھے، اسماعیلی اور اسحاقی، اور دونوں کو برسرِ باطل کہتے تھے، اسماعیلی

سے ان کا مقصود مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کے متبع یعنی حضرات اہلِ حدیث، اور اسحاقی سے مولانا شاہ اسحٰق صاحب دہلوی کے پیرو کار یعنی حضرات دیوبند تھے، آج کل ظرافت سے پہلے کو لال وہابی اور دوسرے کو گلابی وہابی کہا جاتا ہے، مگر بہرحال مخالفین کی نظر میں ہیں دونوں وہابی، مگر یہ گلاب اُن دونوں کلی تھا، پنکھڑیاں آج کی طرح الگ الگ نہیں تھیں،

ان دونوں کے درمیان درحقیقت عقائد کا چنداں فرق نہیں، فرق ہے تو اس کا کہ ایک فقہ میں غیر مقلد ہے، اور دوسرا فقہ میں مقلد،

مولانا سندھی گو بہت سے خیالات میں آزاد ہیں، مگر مقلدیت کے باب میں اُن کا تشدد علیٰ حالہٖ قائم ہے، اس کا اثر اُن کی ہر تحریر میں نظر آتا ہے، موجودہ مناقشہ بھی اسی اصل کی ایک فرع ہے، اور قاضی شوکانی اور محمد بن عبد الوہاب وغیرہ پر ان کے اشارے اسی نوعیت کے ہیں، بہرحال میری یہ تمہید کوئی محاکمہ نہیں، بلکہ فریقین کو ایک دوسرے کے زاویۂ نظر کے سمجھانے میں سہولت بہم پہنچانا ہے۔ "س"

دنیا میں مظلومیتوں کی داستان بار بار دہرائی گئی ہے، تاریخ میں میدانِ جنگ کے ابتلار کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی ہند کی تاریخ میں بعض اکابر امت کی مظلومیت میدان شہادت کی مظلومیت پر بھی بازی لے گئی ہے، اور زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ اس خون کی چھینٹیں ان کے ماننے والوں اور نام برداروں کے دامن پر بھی ہیں،

جہاں تک تاریخی واقعات و حقائق کا تعلق ہے، یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ حضرت سید احمد شہید بریلوی (۱۲۰۱ھ – ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) اور ان کے اصحاب سے پہلے اس خطۂ ارض میں کسی صحیح دینی تجدید و انقلاب کے لئے کوئی منظم اور ہمہ گیر کوشش نہیں کی گئی، اور ہندوستان تو ہندوستان ساری دنیا میں عہد صحابہؓ کے بعد کوئی جماعت طریق نبوت اور اسوۂ نبوی سے اتنی قریب اور ہم آہنگ نظر نہیں آئی،

لیکن حالات اور ماحول کی ستم ظریفی یہ ہے کہ غیر تو غیر اپنوں میں بھی سید صاحبؒ اور ان کے مخصوص اصحاب کا فکر بلند، معتدل مزاج و مشرب اور مسلک و عمل میں عجیب و غریب توازن پورے طور پر نہیں سمجھا گیا، ہر فریق نے اپنے ظن و تخمین کے مطابق انھیں اپنانے کی کوشش کی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کھینچا تانی میں وہ "فکر بلند" تو آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، اور اُن کے ماننے والوں اور پیروی کا دم بھرنے والوں میں تقلید و عدم تقلید، آمین و رفع یدین، دیہاتوں میں نماز جمعہ اور اسی قسم کے چند فروعی مسئلے لڑنے جھگڑنے کے لئے رہ گئے، آغاز کیا تھا، انجام کیا ہوا، دیدۂ عبرت وا ہو، تو بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے،

ہماری بدبختی یہیں ختم نہیں ہوتی، مولوی فضل رسول صاحب بدایونی[1] (ف ۱۲۹۸ھ / ۱۸۷۲ء) سے لیکر ولیم ولسن ہنٹر[2] (W. W. Hunter) راونشا[3] (T. E. Ravenshaw) اور جیمس اوکنلے[4] (James O. Kinealy) تک کی دشنام طرازیاں برداشت کی جا سکتی تھیں، کہ ان سے کلمۂ خیر کی توقع ہی کب تھی؟ مگر جب خود اپنی جماعت کے ممتاز اصحاب فکر ان نفوس قدسیہ کے منہ آئیں

---

[1] مولوی فضل رسول صاحب نے ہندوستان میں غالباً سب سے پہلے وہابی کی اصطلاح استعمال کی (ترجمان وہابیہ عرف رسالہ اشاعۃ السنۃ نمبر ۱۳۰۳ھ صفحہ ۲۱۲) نجد و ہندوستان کے موحدین و مجاہدین پر رنگ برنگ کے الزامات دھرنے میں یہ پیش پیش رہے ہیں، مولانا ابو الکلام آزاد مدظلہ کے تذکرہ میں ان کا ذکر بڑے دلچسپ طریقہ پر آیا ہے، چند سطریں تطرناظرین ہیں "مولوی فضل رسول بدایونی مرحوم سوط الرحمٰن میں لکھتے ہیں:- "داؤد ظاہری شیطان کا متبع تھا، اس کے بعد ابن حزم ظاہری پیدا ہوا، جو خبیث تھا، پھر ابن حزم کا شاگرد ابن قیم ہوا، اور ابن قیم کا شاگرد دمشقی" ابن تیمیہ، ابن تیمیہ نے ایک نیا دین نکالا، "بعض اشرار بد اطوار جہلہ فسقہ در حلقۂ انقیاد ش آمدہ در بلاد اسلامیہ طرفہ ہنگامہ برپا نمودند" اور ان تمام مورخانہ تحقیقات کے لئے آخر میں طبقات سبکی کا حوالہ بھی دیتے ہیں،" الخ (تذکرہ صفحہ ۲۲۶)

[2] ہنٹر صاحب جماعت مجاہدین کے خاص کرم فرما ہیں، انکی کتاب مسلمانانِ ہند (Our Indian Mussalmans) مشہور ہے، مولوی طفیل احمد صاحب کی کتابوں (حکومت خود اختیاری اور مسلمانوں کا روشن مستقبل) میں اس کے کافی اقتباسات ہیں

[3] راونشا ۱۸۶۵ء میں پٹنہ کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا، مولانا احمد اللہ صادقپوری (ف ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء) کے مقدمے کی ابتدائی سماعت اسی نے کی تھی، اسکا فیصلہ اور میمورنڈم ہفوات و خرافات کا مجموعہ ہے، ہنٹر کی کتاب کا ایک حصہ اسی میمورنڈم سے ماخوذ ہے

[4] اوکنلے صاحب بھی مجاہدین کے پرانے مشفق ہیں، سازش کے آخری مقدمے (۱۸۷۱ء مقدمہ پٹنہ بنام امیر خاں، حشمداد خاں، ابراہیم منڈل وغیرہم) میں یہ سرکار کی طرف سے پیروکار تھے، بلاکشانِ الم کی پریشانیوں میں ان کا بھی کافی دخل رہا ہے،

ان کی پاک نیتوں پر حملے کریں، اُن کے حزب المثل اخلاص پر شک کریں، تو پھر خواہ صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ وقت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے، ایک طرف یہ خیال کہ بزرگوں کی غلطیوں پر نکتہ چینی، کہیں بے ادبی نہ شمار کی جائے، عرضِ مدعا سے روکتا ہے، دوسری طرف احساسِ فرض اور یہ خوف کہ اگر سکوت سے کام لے کر غلطیوں کی تصحیح نہ کی گئی، تو کہیں بزرگوں کی یہ لغزشیں آگے چل کر تاریخی حقائق نہ بنجائیں، اظہارِ مطلب پر اکساتا ہے، یوں تو مروت اور صداقت کی کشمکش ہمیشہ صبر آزما ہوا کی ہے، لیکن راقم کے لئے اس تحریر کے سلسلے میں یہ کشمکش بہت طویل اور تکلیف دہ رہی، آخر دو تین مہینوں کی ذہنی الجھن کے بعد دل و دماغ نے اظہارِ مطلب ہی کے حق میں فیصلہ دیا اور زبانِ قلم نے بسم اللہ کہہ کر استدراک کی بسم اللہ کی،

جناب مولانا عبید اللہ سندھی کی زیر نظر کتاب "شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک" "حزب امام ولی اللہ دہلوی کی اجمالی تاریخ" کا مقدمہ ہے، اصل مقدمہ کے آغاز سے پہلے "اجمالی فہرست" میں مضامین کا خلاصہ دیا گیا ہے جس کا لبِ لباب اصل کے جملوں کو مقدور بھر محفوظ رکھتے ہوئے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں، تاکہ تفصیل میں پڑنے سے پہلے مقدمہ کا اجمالی خاکہ نگاہوں کے سامنے آجائے۔

"حکیم الہند امام ولی اللہ نے ۱۲ر ذی قعدہ سنہ ۱۱۴۴ھ (۵ر مئی سنہ ۱۷۳۱ء)[1] سے دہلی کے مفاسد کو ختم کرنے کے لئے توکلاً علی اللہ اپنی ذمہ داری پر ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا،

تاریخ ہند کا یہ عظیم الشان واقعہ انقلابِ فرانس سے ۵۸ سال پہلے ہو گذرا ہے،

حکیم الہند نے اپنا نصب العین معین کیا جمعیۃ مرکزیہ بنائی اور اُس کی شاخیں ملک میں پھیلیں، اس طرح حزب ولی اللہ ایک مسلم پارٹی کی صورت میں ظاہر ہوا، اُس نے حکومت موقتہ (PROVISIONAL GOVERNMENT) بنائی، لیکن ۲۷ر ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۶ھ (۶ر مئی سنہ ۱۸۳۱ء)[2] (بروز جمعہ)

[1] ۱۲ر ذیقعدہ سنہ ۱۱۴۴ھ، ۵ر مئی سنہ ۱۷۳۲ء کے مطابق ہوتی ہے، سنہ ۱۷۳۱ء صحیح نہیں [2] ۶ر مئی سنہ ۱۸۳۱ء روز جمعہ،

کو بالاکوٹ کے معرکۂ شہادت کے بعد اس کا خاتمہ ہوگیا، اس صدی میں اس تحریک کے تین امام ظاہر ہوئے، اور ایک امارت منعقد ہوئی،

(الف) امام ولی اللہ دہلوی سنہ ۱۷۳۱ء، سنہ ۱۷۶۳ء،

(ب) امام عبد العزیز دہلوی سنہ ۱۷۶۳ء، سنہ ۱۸۲۴ء،

(ج) امام محمد اسحٰق دہلوی سنہ ۱۸۲۴ء، سنہ ۱۸۴۶ء،

(د) حکومت موقتہ کے امیر شہید سید احمد سنہ ۱۸۲۶ء، سنہ ۱۸۳۱ء،

یہ تحریک کا پہلا دور تھا،

دوسرا دور امام محمد اسحٰق نے سنہ ۱۸۳۱ء سے شروع کیا، آپ سنہ ۱۸۴۱ء تک دہلی میں رہے، اور سنہ ۱۸۴۶ء تک مکہ معظمہ میں، دہلی میں ان کے نائب مولانا مملوک علی، ان کے بعد الامیر امداد اللہ بارہ برس دہلی میں رہے یعنی سنہ ۱۸۵۸ء تک، اس کے بعد مکہ معظمہ میں،

ان کے پہلے نائب یعنی مولانا محمد قاسم سنہ ۱۸۷۹ء تک، پھر مولانا رشید احمد سنہ ۱۹۰۵ء تک، پھر شیخ الہند مولانا محمود حسن سنہ ۱۹۲۰ء تک، اس سال تحریک کا دوسرا دور ختم ہوا، تیسرے دور کو مولانا شیخ الہند نے سنہ ۱۹۲۰ء سے تھوڑا عرصہ پہلے شروع کیا تھا" (صفحہ ۱-۹)

یہ ہے حزب ولی اللہ کی اجمالی تاریخ کے مقدمہ کا خاکہ، جس میں حضرت سید احمد شہیدؒ کو بالکل ضمنی حیثیت دی گئی ہے، اور ان کے خاص ماننے والوں اور سالہا سال تک علم جہاد بلند کرنیوالوں کے لئے تو اس خاکے میں کوئی گنجائش ہی نہیں، اسلامی ہند کی پہلی اور (اب تک) آخری تحریک تجدید انقلاب میں سید صاحبؒ کو ضمنی حیثیت دینا، حقیقت و صداقت کا خون کرنا ہے، سچی بات یہ ہے کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۲) ۲۴ر ذیقعد سنہ ۱۲۴۶ھ ہے نہ کہ ۲۷ر ذیقعدہ، ۲۷ر ذیقعد ۹ر مئی دوشنبہ ہوگی، غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے، سید صاحب کی شہادت ۲۴ر ذیقعد سنہ ۱۲۴۶ھ کو ہوئی ہے، (سیرت سید احمد شہید صفحہ ۲۲۶) [1] اس فہرست میں صرف عیسوی سنہ (سنین) دئے گئے ہیں،

مولانا سندھی نے اس باب میں سید شہیدؒ کے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے، اور پھر امیر شہیدؒ (مولانا کی اصطلاح کے مطابق) کی اس "ضمنی حیثیت" کو بجا ثابت کرنے کے لئے اُن کی طرف طرح طرح کی باتیں منسوب کی گئی ہیں، اور اسی پر بس نہیں، تحریک کے دوسرے دور میں مولانا محمد اسحٰقؒ سے مولانا محمود الحسنؒ تک مختلف افراد کی مسلسل امارت و امامت ثابت کرنے کے لئے سید شہیدؒ کے جان نثار و پورب کے سرفروش مجاہدوں اور شہیدوں، سرکار انگریزی کے ممنونِ التفات اہلِ صادق پور[1] بدنام وہابیوں اور عام جماعت اہلِ حدیث کو زیدیت، شیعیت، رفض اور مختلف القاب سے اس بیدردی کے ساتھ نوازا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے، اور رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک وسیع النظر عالم اور ممتاز صاحب فکر کے قلم سے ایسی لغزش کیونکر ہوئی؟ اور اسی لپیٹ میں یمن کے سلفی عالم و محدث قاضی محمد بن علی شوکانی (ف ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) اور نجد کے مظلوم مصلح شیخ محمد بن عبد الوہاب (ف ۱۲۰۶ھ/۱۷۹۲ء) اور اُن کے متبعین بھی آگئے ہیں، زیر تحریر استدراک کا مقصد انہی مظالم کا مداوا کرنا ہے،

---

[1] صادق پور، شہر عظیم آباد پٹنہ کا ایک محلہ ہے، یہاں کا ایک ہاشمی خاندان عرصۂ دراز سے علم و فضل میں ممتاز رہا ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ نے جب علم جہاد بلند کیا، تو اس خاندان کے ایک ممتاز فرد مولانا ولایت علی (ف ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء) لبیک کہنے والوں کی صف اوّل میں تھے، اور پھر اُن کی تبلیغ سے پورا خاندان سید صاحبؒ اور اُن کی دعوت کا علم بردار ہوگیا، اور اس سلسلے میں ان لوگوں نے وہ کچھ کر دکھایا جو رہتی دنیا تک یاد رہے گا، ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید صاحبؒ کی شہادت (۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) سے لیکر ۱۸۷۱ء تک حکومت کی دار و گیر کے باوجود مسلسل چالیس سال تک صادق پور والوں نے جہاد کا علم سرنگوں نہیں ہونے دیا، پھانسی، جلا وطنی، حبس دوام، ضبطی اور ہر قسم کی ممکن اذیتیں انہیں دی گئیں لیکن یہ اللہ کے بندے راہ حق سے نہ ہٹے، بڑی درد انگیز اور ولولہ خیز داستان ہے کبھی اطمینان سے سنائی جائیگی، سیرت سید احمد شہید (ص ۳۰۵-۳۲۰ طبع دوم) کے چوتھے باب میں بھی اس جماعت کی مختصر سرگذشت آگئی ہے، خاندانی حالات کے لئے مولانا عبد الرحیم صادق پوری اسیر پورٹ بلیر و متہم سازش انبالہ ۱۸۶۴ء (ف ۱۳۴۱ھ/۱۹۲۳ء) کی تذکرہ صادقہ ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جماعت کے کاموں کے متعلق بھی اس میں بکھرے ہوئے لیکن قیمتی معلومات ملتے ہیں،

یوں تو راقم کو حزب ولی اللہ اور حکمت ولی اللہی کی نئی تفسیر و تشریح سے بھی اتفاق نہیں، کتاب و سنت کے علاوہ کسی امام یا حکیم کے مرتب کردہ فلسفہ و حکمت کو دعوت کی اساس بنانا اسلامی نقطۂ نگاہ سے صحیح نہیں، خواہ اس مخصوص فلسفہ و حکمت کے اجزائے ترکیبی تعلیمات ربانی ہی سے کیوں نہ ماخوذ ہوں؟ تجدید کا بلا واسطہ صرف قرآن کریم اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر ہونا چاہئے، ورنہ اشخاص و افراد کے نام پر جو تحریک بھی اُٹھائی جائے گی اس کا کتاب و سنت کے صراط مستقیم سے ہٹ جانا ضروری ہے، اور اگر وہ تحریک اس گھاٹی سے بھی صحیح و سالم بچ نکلی، تو کم سے کم ایک نئے فرقے کا ظہور یقینی ہے، جو اپنی جگہ پر خود ایک مستقل فتنہ ہے،

یہ تو ایک اصولی بات تھی، ورنہ مولانا سندھی کی تفسیر کے مطابق حزب ولی اللہ اور حکمت ولی اللہی کے خمیر میں وقت کی بعض مقبول لیکن بر خود غلط تحریکوں کے جراثیم صاف نظر آتے ہیں، اکبر کے رسوائے عالم "دین الٰہی" کی مدح سرائی[1] (ص ۱۰۴) اور ابلیس کی مینی "نیشنلزم" کا رجز میخانۂ مغرب کا فیض نہیں تو اور کیا ہے؟ آخر یہ کیا بات ہے کہ شیخ الہند کا شاگرد ہندوستان چھوڑتے وقت تو اتحاد اسلامی کا حامی تھا، اور واپسی کے بعد وہ خالص نیشنلسٹ ہونے پر فخر کرتا ہے:

---

[1] اس ملک میں جو مختلف مذاہب کا مجموعہ ہو، حکومت چلانے کے لئے بادشاہ اور اسکی انتظامی کونسل کا کیا طرز عمل ہوگا؟ اس کے لئے اکبر نے "دین الٰہی" کا فقرہ ایجاد کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اور اسکی مرکزی کونسل کسی خاص مذہب کے طرفدار نہیں ہونگے، مگر مطلق مذہب کی پابندی سے بھی اپنے کو آزاد نہیں کرینگے، اور لا دینیت نہیں آنے پائیگی، (ص ۱۰۴) کیا دین الٰہی کے متعلق یہ بیان تاریخی طور پر صحیح ہے! مزید تفسیر ملاحظہ ہو،

"ہماری رائے میں اکبر نے جو کام شروع کیا تھا وہ اساساً صحیح تھا اور عملاً غلطیاں اسلئے ہوئیں کہ اس عظیم الشان کام کو چلانے کے لئے آدمی میسر نہیں آتے تھے، ہمارا خیال ہے کہ وہ ضرورتیں خدا تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ کے ذریعہ پوری کر دیں، شاہ صاحب نے اس کام کو مکمل کر دیا جو اکبر نے شروع کیا تھا کیونکہ وہ بھی اسلام کو انسانیت کی تفسیر بتاتے ہیں، آپ تمام ادیان کو منطبق کر سکتے ہیں، ان کے طریقے پر ایک مسلم عالم اس نظام سلطنت کو چلا سکتا ہے، جو اکبر کا مقصد تھا، الخ الخ (ص ۱۰۵)

کیا اس کے بعد کسی رائے زنی کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

"جب ہم ہندوستان سے نکلے تھے تو اتحاد اسلام کے حامی تھے یعنی انٹرنیشنل پروگرام رکھتے تھے مگر جب
ہم واپس آئے تو سوقت خالص نیشنلسٹ ہیں، یہ سبق ہمیں کابل کی زندگی نے سکھایا ہے"! (صفحہ ۱۲۶)

اللہ رے! انقلابِ حال!! امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا شارح و مبلغ خالص نیشنلسٹ
ہونے پر فخر محسوس کرتا ہے، فاعتبروا یا اولی الابصار،

اس جملہ معترضہ سے یہ حقیقت ظاہر کرنا تھی کہ گو اس "استدراک" میں ہمارا روئے سخن زیادہ تر ان
غلط بیانیوں کی طرف رہے گا جو حضرت سید احمد شہیدؒ، ان کے متبعین اور تجدید و عمل کے دوسرے
اکابر امت کے متعلق کی گئی ہیں، لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حکمتِ ولی اللہ کی اس تشریح و تفسیر
سے بھی ہمیں اتفاق ہے جس کی تبلیغ اس کتاب میں کی گئی ہے، اور جس میں روس اور ترکی کے نمونے پر
ایک نظامِ عمل "شاہ صاحب کا اجمالی پروگرام" کے نام سے پیش کیا گیا ہے، (صفحہ ۳۰-۳۵)

مولانا سندھی کے بیان کے مطابق حزب ولی اللہ کے تین امام ظاہر ہوئے، اور ایک امارت
منعقد ہوئی، شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبد العزیزؒ، شاہ محمد اسحٰقؒ کو وہ ائمہ میں شمار کرتے ہیں، اور حضرت سید احمد
شہیدؒ کو حکومت موقتہ کے امیر کا درجہ دیتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ واقعات اس "بیان" کا ساتھ نہیں دیتے
پہلے تو یہ تسلیم اللہ ہی محلِ نظر ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ صاحب نے کوئی سیاسی پارٹی بنائی تھی تصنیفات
میں وقت کے حالات اور ملکی مصالح کے متعلق اشارات کا ملنا اور بات ہے اور کسی سیاسی پارٹی
کی تشکیل بالکل دوسری چیز ہے، جہاں تک پتہ چلتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اصلاح
و تجدید کی نشان دہی، اور صرف فکری تشکیل کی تھی، ان کے بنائے ہوئے خاکے کی تکمیل عملی جد و جہد
اور سرفروشانہ اقدام کا رتبہ بلند تکیہ رائے بریلی کے سید زادے اور خود ان کے پوتے کے لئے مقدر
ہو چکا تھا، اور اللہ بالاکوٹ کی سرزمین پر اپنی رحمت کے پھول برسائے، کہ وہاں ناموسِ ملت خوابیدہ
میں ہے، بہر حال اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے مولانا کی ہمنوائی میں حزب ولی اللہ کی تشکیل اور اکی

تمام تفصیلات کو تسلیم کرلیں تو ہمیں پچھلی ڈیڑھ صدی کی تاریخ از سرِ نو لکھنا پڑے گی، اسلئے کہ حضرت شاہ
ولی اللہؒ اور ان کے بعد شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی امامت اور مرکزی حیثیت قبول کرنے میں تو کوئی
دقت نہیں، لیکن شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے بعد شاہ محمد اسحٰق صاحبؒ کو حزب کا امام اور سید شہیدؒ کو انکا
ماتحت اور امیر بنا کر پیش کرنا حق و صداقت سے ٹکر لینا ہے، تاریخ جب آپ کے منشا کے مطابق نہیں بنی
تو اب تاریخی حقیقتوں کو توڑ مروڑ کر اپنے خیالات کا تابع بنانے کی کوشش کرنا بے سود ہے، اور مولانا سندھی
کی یہی بنیادی مسامحت ہے جس نے اس "تاریخی مقدمہ" کو مفروضات اور قیاس آرائیوں کا مجموعہ بنا دیا ہے

اب آئیے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوں، فاضل مصنف نے حضرت سید شہیدؒ کی امامت و
امارت پر جو اعتراضات کئے ہیں، اُن پر نظر ڈالنے سے پہلے مصنف کے اعترافِ فضل کی طرف بھی اشارہ
کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ جہاں تک ان کے مقاصد سے تعارض نہیں ہوتا، وہ
سید شہیدؒ کے کمالات کے اعتراف میں رطب اللسان ہیں:

"حضرت سید احمد بریلوی جوان کے مدرسہ کے شاگرد تھے، مگر قوت کشفی میں اپنے زمانہ کے عارفین
بلکہ بہت سے متقدمین پر بھی سبقت لے گئے تھے، ان کی تربیت شاہ عبد العزیز اور شاہ عبد القادر کی
صحبت میں مکمل ہوئی"۔ (صفحہ ۴۲)

یہاں عاجز صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہے کہ سید صاحب کو اس گھر سے صرف تلمذ ہی نہ تھا، بلکہ
شاہ عبد العزیز صاحب سے بیعت بھی حاصل تھی، (سیرت سید احمد شہید، طبع دوم صفحہ ۵۵)

اب اس "اعتراف کے بعد" مدح و ذم" کی آمیزش ملاحظہ ہو۔

"شاہ عبد العزیز کا پروگرام ہی تھا کہ کابل اور قندھار کی طاقت کو دعوت دے کر دہلی بلایا جائے،
..... اسکے لئے وہاں ایک امارت قائم کرنے کی ضرورت ہوگی، اور افغانوں میں ایک سید کی امارت
بہت جلد مقبول ہو سکتی ہے اس کے لئے سید صاحب کو امیر مقرر کیا گیا اور مولانا شہید اور مولانا عبد الحی

کو ان کا وزیر بنا کر ساتھ کر دیا گیا"۔ (ص ۹۳)

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ "سیدزادگی" کے سوا سید صاحبؒ میں اور کوئی خاص بات نہیں تھی، مگر اس پر بھی مولانا کو اطمینان نہیں، دنیا تو یہی جانتی ہے کہ پنجاب و سرحد میں احیائے جہاد کی ساری کوششیں سید صاحبؒ ہی کی دعوت اور جد و جہد کا نتیجہ تھیں، اس سے آگے بڑھکر ذرا صاف الفاظ میں فرماتے ہیں:

"سید صاحب اور مولانا شہید اور مولانا عبد الحئی اس انقلابی پروپگنڈے کے مرکز بنائے گئے شاہ عبد العزیز نے شاہ اسحٰق کو اپنی جگہ مقرر کیا، ہماری سمجھ میں اس نئے حزب کے امیر شاہ اسحٰق تھے، سید صاحب فقط امیر الدعوت والجہاد تھے، اور یہ جماعت دہلی کی سلطنت کی کمزوری کو دور کرنے کے لئے کھڑی ہو رہی ہے، اس کو ایک حکومت موقتہ کا درجہ دینا چاہئے"۔ (ص ۹۳)

ان تین سطروں میں متعدد ایسی باتیں کہی گئی ہیں، جو تنقید کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں (الف) شاہ عبد العزیز نے شاہ اسحٰق کو کب مقرر کیا؟ یہ بیان محتاج ثبوت ہے، اور اس کے لئے مستند تاریخی شہادت کی ضرورت ہے (ب) سید صاحبؒ کو فقط امیر الدعوت والجہاد کہنا بے معنی بات معلوم ہوتی ہے، صورت واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ سید صاحبؒ اور اُن کے رفقاء کر رہے تھے، جن میں مولانا عبد الحئیؒ اور مولانا شہیدؒ "شیخین" کا درجہ رکھتے ہیں، اور فوری طور پر ان کے سامنے اصلاح رسوم و بدعات کے علاوہ پنجاب میں سکھوں سے جہاد کرنا تھا، گو ان کے مقاصد بہت بلند تھے، (ج) یہ کہنا کہ "یہ جماعت سلطنت دہلی کی کمزوری دور کرنے کے لئے کھڑی ہو رہی ہے" سید صاحبؒ اور ان کے اعلیٰ مقاصد کی تنقیص ہے، سید صاحبؒ خالص اسلامی نظام چاہتے تھے، خلافت راشدہ کے نمونے پر حکومت الٰہی کی تاسیس ان کا مقصد تھا، دہلی کی سلطنت کبھی اسلامی سلطنت نہیں رہی، سید صاحبؒ کا نصب العین اور مقصد اس قدر واضح ہیں کہ ان میں کسی شک و شبہہ کی گنجایش ہی نہیں، جہاد کا ارادہ بھی کسی حزب کی تاسیس و تشکیل سے شروع نہیں ہوا اور امپوریں ولایتوں سے مسلمانان پنجاب کی دردانگیز حالت

سنی اور نیت اسی وقت مستحکم ہو گئی، (سوانح احمدی ص ۲۲) رہا جہاد و ہجرت اور نصب امامت کا مقصد عالی تو اسے خود انہی کی زبان سے سنئے، سردار سلطان محمد خاں اور سردار سعید محمد خاں کو تحریر فرماتے ہیں:-

رب غیور کہ علیم بذات الصدور است آگاہ است بر این معنی کہ این جانب را از قبول این منصب غیر از اقامت جہاد بر وجہ مشروع وحصول معنی انتظام در عساکر اہل اسلام غرض دیگر از اغراض نفسانیہ ... ... نیست ... ... آرے این قدر آرزو دارم کہ در اکثر افراد بنی آدم بلکہ در جمیع اقطار عالم احکام رب العالمین کہ مسمی بشرع متین است بلا منازعت احدے نافذ گردد ...[1] (سیرت سید احمد شہید ص ۱۱۰)

رب غیور جو کہ دل کے حال سے اچھی طرح آگاہ ہے اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ میری اس منصب (امامت) کے قبول کرنے سے سوا کوئی دوسری نفسانی غرض نہیں کہ جہاد کو شرعی طریقے پر قائم کیا جائے اور مسلمانوں کی فوجوں میں نظم قائم ہو ... ... ہاں اس قدر آرزو رکھتا ہوں کہ اکثر افراد انسانی بلکہ تمام ممالک میں رب العالمین کے احکام جن کا نام شرع متین ہے بلا کسی کی مخالفت کے جاری ہو جائیں، ... ...

ہمیں کوئی بتائے کہ دہلی کی حکومت کو کسی دور میں اس مقصد عالی سے کوئی دور کا تعلق بھی رہا ہے؟

لَشَتَّانَ مَا بَیْنَ الْیَزِیْدَیْنِ فِی النَّدَیٰ ۔۔۔ یَزِیْدُ سُلَیْمٍ وَالْاَغَرِّ بْنِ حَاتِمٍ

سید صاحبؒ کو ایک ضمنی حیثیت دیدینا تو آسان ہے، لیکن واقعات کی تکذیب بہت مشکل ہے،

[1] سید صاحبؒ اور مولانا شہید کے خطوط میں اس قسم کے بیانات اتنے واضح اور بے لاگ طریقے پر ہیں کہ ان میں کسی چون و چرا کی گنجایش ہی نہیں ہے، ان خطوط کا ایک معتدبہ حصہ سوانح احمدی کے آخر میں موجود ہے، (ص ۲۴۳-۱۶۹) ان مطبوعہ خطوط کے علاوہ مکاتیب کا اچھا خاصہ قیمتی ذخیرہ ابھی محفوظ ہے، جن سے سیرت سید احمد شہید کے لائق مصنف نے فائدہ اُٹھایا ہے (ص) مضمون کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو مزید اقتباسات دئے جاتے، ان بزرگوں کے بلند مقصد اور اسلامی روح کا اندازہ لگانے کے لئے صرف ان دو خطوں کا مطالعہ کافی ہوگا، جو سیرت سید احمد شہید کے (ص ۱۵۹) میں درج کئے گئے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد مولانا عبدالحئی بڈھانوی (ف ۱۲۴۳ھ) اور بھتیجے مولانا اسمٰعیل شہیدؒ (ش ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) جن میں سے ہر ایک کا مرتبہ خاندانِ ولی اللٰہی میں مسلم ہے، سید صاحبؒ کے جان نثاروں میں شامل تھے، خدام کی طرح ان کی رکاب تھامے پھرتے تھے، (سیرت سید احمد شہید ص ۳۵۸-۳۱۵) اور اپنی جگہ پر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاہ صاحب کے سلسلے اور خاندان میں ان دو بزرگوں کا مرتبہ مولانا شاہ محمد اسحاقؒ سے کہیں بڑھا ہوا ہے (سیرت سید احمد ص ۳۱۵) اس کی پیش بندی مولانا کس طرح فرماتے ہیں، ملاحظہ ہو:

"...... مگر اس امارت کو تھامنے کے لئے جس قدر تعلق شاہ ولی اللہ کی تحریک اور پھر شاہ عبدالعزیز کے کام سے تاریخی طور پر ہونا چاہئے، اس سے سید صاحب کوئی تعلق نہیں رکھتے، ممکن ہے کہ وہ ایک نئی تحریک شروع کر دیں۔ ...... اس نقص کے جبر کے لئے مولانا عبدالحئی اور مولانا شہیدؒ انکے ساتھ لگا دیئے گئے۔" (ص ۱۴۱)

اس بیان سے، معاذ اللہ، یہ شبہہ ہوتا ہے، کہ شیخین کے ذمہ جاسوسی کی خدمت سپرد کی گئی تھی، کہاں کی بات کہاں پہنچتی ہے؟

اس جبر نقص کی مزید تشریح مولانا کے شاگرد اور اس کتاب کے[1] مرتب و شارح مولوی نور الحق صاحب علوی کی زبان سے سنئے:۔

"امیر شہید دراصل اس حزب سے نہیں بلکہ بعد میں منضم کئے گئے، ان میں کشفی کمالات تھے سپاہ گری کی تعلیم تھی، سید تھے، اس لئے ان کو امام عبدالعزیزؒ نے امارت جہاد کے لئے موزوں قرار دیا، مگر اس خیال سے کہ کہیں حزب مذکور کی راہ سے نہ ہٹ جائیں، ان کے ساتھ دو وزیر اپنے تکمیل تربیت یافتہ لگا دئے، مگر اپنا صحیح اور پورے معنوں میں جانشین حضرت شاہ اسحٰقؒ کو مقرر کیا" (ص ۱۴۳)

آپ سمجھے یہ "نئی تحریک" کیا چیز ہے؟ اور "حزب مذکور کی راہ سے ہٹنا" کیا معنی رکھتا ہے؟ اسکی

[1] یہ کتاب اصل میں مولانا سندھی نے املا کرائی ہے، اور علوی صاحب نے مولانا سے سبقاً سبقاً پڑھ کر اسے مرتب کیا ہے، اور ساتھ ساتھ تشریحی حاشیے بڑھا دیئے ہیں، (دیباچہ کتاب)

تفسیر خود مولانا کی زبان سے سننے کے لائق ہے:۔

"اس طرح اس خاندان میں (یعنی حضرت سید شہیدؒ کے خاندان میں) حضرت مجدد سرہندیؒ اور مجدد دہلویؒ کی برکتیں جمع ہو گئیں، یہ خاندان اپنا خصوصی مشرب اور مخصوص فکر رکھتا ہے، یہ خصوصیت امیر شہید کے خاندان میں حضرت مجدد کے خلیفہ شیخ آدم بنوریؒ سے متوارث چلی آتی ہے، بنا بریں سید امیر شہید کا حزب ولی اللہ کے رنگ میں پورے طور پر رنگا جانا بعید ہے[1]، یہی وجہ ہے کہ جب انھیں موقع ملا تو انھوں نے اپنے امیر المومنین ہونے کا اعلان کر دیا، اور تحریک ناکام رہ گئی۔"

اچھا صاحب! سید صاحب نے موقع ملتے ہی "نئی تحریک" کھڑی کر دی، اور اپنے امیر المومنین ہونے کا اعلان کر دیا، لیکن امام عبدالعزیزؒ کے مقرر کردہ اور "تکمیل تربیت یافتہ" وزیروں (مولانا عبدالحئیؒ اور مولانا شہیدؒ) کو کیا ہو گیا تھا کہ انھوں نے بھی بیعت کر لی، اور صرف بیعت ہی نہیں کی، بلکہ اس کے انعقاد اور تبلیغ میں اپنے شایانِ شان نمایاں حصہ بھی لیا، (ملاحظہ ہو۔ مولانا شہیدؒ کا مکتوب مندرجہ سیرت سید احمد شہید ص ۱۷۱-۱۷۹) علاوہ بریں مولانا کے بیان کے مطابق امام عبدالعزیزؒ نے "جمعیۃ مرکزیہ" کی مدد سے جو نوجوان "تیار کئے" ان میں "سرکردہ" تین یا چار بزرگ تھے، (۱) مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ (۲) مولانا عبدالحئی دہلویؒ (۳) مولانا محمد اسحٰقؒ (۴) مولانا محمد یعقوبؒ (ص ۱۱۳) اور یہ معلوم ہے کہ انعقاد بیعت کے اجتماع میں اس "سرکردہ جماعت" کے دو زیادہ ممتاز رکن شریک تھے، (یعنی مولانا عبدالحئیؒ اور مولانا شہیدؒ) اور جب اس کی خبر مولانا اسحاق اور مولانا یعقوب کو ملی، تو وہ معترض نہیں ہوئے، بلکہ برابر "اموال و رجال" سے امداد میں سرگرم رہے، اس طرح "جمعیۃ مرکزیہ" کی تربیت یافتہ "سرکردہ جماعت" کا سید صاحبؒ کی امامت پر اجماع ثابت ہوتا ہے جس سے کوئی غیر جانبدار انکار کی جرأت نہیں کر سکتا،

[1] خط کشیدہ فقروں کے علاوہ ان سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے، اسکی صحت سے ہمیں انکار نہیں،

ناکامی تحریک کی ناکامی "سو اس کے دوسرے اسباب ہیں، جن میں سرداران پشاور کی غداری اور سکھ کی زیادہ اہم ہے[1] خود مولانا بھی اس اجماع کو تسلیم کرتے ہیں، اور ساتھ ساتھ اسے اختلافات کا منبع بھی بتاتے جاتے ہیں:

"۱۲۳۹ھ میں شاہ عبد العزیز کا انتقال ہوا، اسی سال سید صاحب اور ان کے رفقاء (مولانا اسمٰعیل و مولانا عبد الحئی وغیرہ) نے ہجرت کا ارادہ کیا، ۱۲۴۲ھ میں سید صاحب کی امامت پر اجماع منعقد ہوا، اور وہی اختلاف کا منبع بن گیا۔" (ص ۱۱۶)

دوسری جگہ اس "بیعت امامت" کو ان لوگوں کی "مداخلت" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، جو امام عبد العزیز کے تربیت یافتہ نہ تھے:

"یہاں یہ غلطی ہوئی کہ شاہ صاحبؒ کے فیصلے یعنی بورڈ کی حکمت کو نہ سمجھ کر سید صاحب کو امیر مطلق یعنی امام کے درجے پر مان لیا گیا، اور یہ ان لوگوں کی مداخلت سے ہوا، جو امام عبد العزیز کے تربیت یافتہ نہ تھے، اس شکست میں اس اصولی تبدیلی کو بڑا دخل ہے۔" (ص ۱۵۲)

خیر شکست کے اسباب تو دوسرے ہیں، یہاں ہمیں صرف یہ دریافت کرنا ہے کہ "حزب ولی اللہ" کے خاص ارکان اور امام عبد العزیز کے "تربیت کردہ اصحاب" اور سید صاحب کی جماعت میں "شیخین" کا رتبہ رکھنے والے بزرگوں (مولانا عبد الحئیؒ اور مولانا شہیدؒ) کی موجودگی میں دوسرے لوگوں کو "مداخلت" کا موقع کس طرح مل گیا؟ اور پھر صرف ان وزیروں پر بس نہیں، "ان" "ولی اللہیوں" نے بھی سید شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت کی، جو میدان جہاد سے دور ہندوستان میں ہی تھے، خود مولانا کا بیان ہے:-

واستخلفه الامام عبد العزیز

امام عبد العزیز نے ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) میں سید صاحب

[1] ناکامی کے اسباب کو ہم یہاں نہیں چھیڑنا چاہتے ورنہ مضمون تبصرہ کی حد سے نکل کر ایک رسالہ کی شکل اختیار کر لیگا، سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنے مقالے میں ناکامی کے اسباب پر مختصر لیکن اچھی تحقیقی بحث کی ہے اسے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، (الفرقان ولی اللہ نمبر طبع اول ص ۹۰-۹۱)

سنة ۱۲۳۱ (۱۸۱۶) لامامة الدعوة الی اتباع السنة والجهاد وجعل معه من العلماء مولانا عبد الحئی الصدر السعید ومولانا اسمٰعیل الصدر الشهید کالوزیرین وکان امرهم بالشوریٰ بینهم واذا اتفق الثلثة علی شئ یکون مثل حکم الامام عبد العزیز (ص ۱۴۷)

کو اتباع سنت اور دعوت جہاد کی سربراہی (امامت) کے لئے اپنا جانشین بنایا، اور علماء میں سے صدر سعید مولانا عبد الحئی اور صدر شہید مولانا اسمٰعیل کو وزیر کے طور پر ان کے ساتھ کر دیا، تمام اہم امور ان کے درمیان "شوریٰ" سے طے ہوتے تھے، اس طرح پر کہ اگر تینوں کسی بات پر متفق ہو جاتے تو وہ امام عبد العزیز کا فیصلہ سمجھا جاتا،

یہاں مولانا سندھی سے یہ خادم دریافت کر سکتا ہے کہ جب سید شہید کی بیعت امامت پر ان تینوں صاحبوں کا "الثلثة" بہ شمول سید صاحب اتفاق ہو گیا تھا تو پھر اسے امام عبد العزیز کا فیصلہ کیوں نہیں سمجھا جاتا؟

ابھی سلسلۂ بیان جاری ہے:-

واقاموا حکومة موقتة کان امیرها السید احمد فی ۱۲ جمادی الاخرة سنة ۱۲۴۲ (۱۰ نومبر ۱۸۲۶ء) و بایع الافاغنة اکثرهم بامامة الامیر ... وکذالک بایع امامة الامیر من کان من الولی اللهیین بالهند

اور ان لوگوں نے ۱۲ جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ[1] (۱۰ نومبر ۱۸۲۶ء) کو ایک حکومت موقتہ قائم کر لی جس کے امیر سید احمد تھے اور اکثر افاغنہ نے امیر کے ہاتھ پر امامت کی بیعت کی، نیز امیر کی امامت کی بیعت ان ولی اللہیوں نے بھی کی جو ہندوستان میں رہ گئے تھے، اور وہ

[1] ۱۲ جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کے مطابق ہوتی ہے، دوسری جگہ اسی کتاب میں (ص ۱۵۶) تقریباً صحیح تاریخ دی گئی ہے، (۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء) قمری مہینوں کی مطابقت میں ایک دن کا اختلاف ہو سکتا ہے، ہمارے سامنے اس وقت انجمن ترقی اردو (دہلی) کی مرتب کردہ جنتری (تقویم ہجری و عیسوی) ہے،

وکانوا یمدونھم بالاموال والرجال (ص ۱۴۲ بحوالہ کتاب التمہید)

مجاہدین کی آدمی اور روپیے سے مدد کرتے رہتے تھے۔ (ص ۱۴۲)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید شہیدؒ کی امامت پر وقت کے تمام ولی اللہیوں کا اتفاق ہو گیا تھا، اور خود مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب بھی یقینی ان میں شریک ہوں گے، آخر وہ ولی اللہیوں سے خارج تو تھے نہیں لیکن مولانا کو تو اپنا "نظریہ" پیش کرنا ہے، خواہ واقعات سے تائید نہ ہوتی ہو، اس لئے کتاب التمہید کے اس بے لاگ بیان کے ساتھ چند فقرے اپنے مطلب کے بھی چسپاں کئے گئے:۔

وھذا الامر کان مرکزہ ادارۃ الدھلی (کذا)، وکان الصدر الحمید مولانا محمد اسحق مدیرا (ص ۱۴۳)

اس کا مرکزی دفتر دہلی تھا، اور مولانا محمد اسحق اس کے ڈائرکٹر تھے،

اصل میں "ہذا الامر" کا فقرہ ہے، اس سے اگر مراد امامت اور نصبِ امارت کی قوت یا قیادتِ علیا مراد ہے، تو وہ دہلی میں کیسے ہو سکتی ہے؟ امیر منتخب میدانِ جہاد میں موجود ہے، اور اس کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے خواص و عوام کے ساتھ امام عبد العزیز کے مقرر کردہ وزیر بھی ہیں، انہی تینوں بزرگوں کا نام مولانا نے "بورڈ" رکھا ہے، اس کے بعد دہلی یا میدانِ جہاد سے دور رہنے والے بزرگ صرف آدمی اور روپئے (الاموال والرجال) سے مدد کر سکتے ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا شاہ محمد اسحق اس میں سرگرم تھے، اور ہو سکتا ہے کہ اس تنظیم کا بار ان ہی کے کندھے پر ہو[۱]،

اس حقیقت کو مولانا نے خود بھی ایک دوسری جگہ صاف طور پر بیان کیا، ہے اعربی دینا ہے

[۱] مولانا نے بار بار زور دیا ہے کہ "مولانا محمد اسحق کے ہاتھ میں روپیہ روانہ کرنے کا انتظام تھا،" (ص ۱۲۰-۱۲۳) ہمیں اس کے ماننے میں ادنیٰ تامل نہیں، اس سے تو صرف اتنا ثابت ہوتا ہے، کہ مولانا شاہ محمد اسحقؒ جماعت مجاہدین اور ان کے امیر کی اعانت میں سرگرم تھے، ..، یہ نتیجہ نکالنا کہ مولانا اسحقؒ ہی جزو کل تھے، اور سید شہید ان کے کمانڈر کی حیثیت رکھتے تھے کسی طرح صحیح نہیں،

اسلامی ہند کی اس اسلامی تحریک کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں:

النھضۃ التی قام بھا الامام عبد العزیز الدھلوی ارتقت من سنۃ ۱۲۴۲ھ الی الحکومۃ الموقتۃ الھندیۃ فی جبال الافغانیین من حدود الھند ورئیس تلک الحکومۃ الشرعیۃ کان امیر المومنین السید احمد الدھلوی (؟) (الامیر الشھید) وصدارۃ وزرائھا اسندت الی مولانا عبد الحئ الدھلوی (؟) (الصدر السعید) والامور الحربیۃ والسیاسیۃ کانت موکولۃ الی مولانا محمد اسماعیل الدھلوی (الصدر الشھید) واما الامور التی تشبہ الداخلیۃ من جمع الاموال وحشد الرجال وغیرھما فکان وکیلھا فی الدھلی (کذا)

امام عبد العزیز کے ہاتھوں جو تحریک اٹھی وہ آگے چل کر (۱۲۴۲ھ سے) سرحدی علاقوں میں ایک حکومت موقتہ ہندیہ کی شکل میں ظاہر ہوئی، اس شرعی حکومت کے صدر امیر المومنین سید احمد دہلوی (؟ بریلوی) (امیر شہید) تھے[۱] اور صدارت عظمیٰ کا منصب مولانا عبد الحئی دہلوی (؟ بڈھانوی) (صدر سعید) کے سپرد تھا، اور امور حربیہ و سیاسیہ کی سربراہی مولانا محمد اسماعیل دہلوی (صدر شہید) کے ذمہ تھی، باقی رہے وہ امور جو وزارتِ داخلیہ کے منصب سے مشابہ ہیں، جیسے آدمی اور روپے کی فراہمی وغیرہ، تو ان کے وکیل دہلی میں مولانا محمد اسحاق (صدر حمید) تھے،

[illegible]

[۱] پتہ نہیں، سید شہید کو دہلوی کس طرح لکھ دیا گیا؟ ممکن ہے کتابت یا طباعت کی غلطی ہو، مولانا عبد الحئی بڈھانوی کو شاید قرابت کے باعث دہلوی لکھا گیا ہو،

ہمارا خیال ہے کہ مولانا کا یہ بیان اس باب میں فیصلہ کن ہے، رئیس حکومت اور وکیل دار الخلیفہ کے مراتب میں جو فرق ہے وہی سید شہیدؒ اور مولانا شاہ محمد اسحاق کے درمیان ملحوظ رکھنا چاہئے، اور یہ ان بزرگوں کے باہمی فرق مراتب کے متعلق عرض کیا جا رہا ہے، ورنہ ہمارے لئے سب لائق احترام و عقیدت ہیں،

این سلسلۂ طلائے ناب است   این خانہ تمام آفتاب است

اور حاشا کہ ہمارے وہم و گمان میں بھی کسی کے ساتھ سوء ادب کا ادنیٰ شائبہ آیا ہو، اعاذنا اللہ من ذلک وکفیٰ بہ علیما،

سید شہیدؒ اور مولانا محمد اسحاق کے درمیان کیا فرق مراتب تھا، اور یہ کہ شاہ اسحاق صاحب سید صاحبؒ کی مالی امداد میں کس قدر سرگرم تھے، اس کا اندازہ خود حضرت سید شہید کے ایک مکتوب سے بھی ہوتا ہے، جو میدان جہاد سے مولٰنا محمد اسحاق کے نام تحریر کیا گیا تھا،

"بسم اللہ الرحمن الرحیم، از امیر المومنین سید احمد بخدمت بابرکت صاحبزادۂ والاتبار مولانا محمد اسحاق صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ، بعد از سلام مسنون و دعاے اجابت مقرون واضح آنکہ بتاریخ دہم ماہ رمضان ہنڈوی مبلغ ہفت ہزار و صد و پنجاہ روپیہ رسید لیکن بجز یک پرچہ کاغذ یک خرمہرہ ہم نرسید، موجبش دریافت نیست، لازم کہ سبب تعویق آن بر آن بنگارند،

زیادہ والسلام مع الاکرم. (سوانح احمدی ص ۲۳۵)

کیا سید صاحبؒ کے مرتبے کا آدمی جو اعلیٰ "کشفی قوت" کا حامل ہو، اپنے مطاع اور سردار کو صاحبزادہ والاتبار سے خطاب کر سکتا ہے؟

اب ہم انتہائی رنج و قلق کیساتھ مولانا سندھی کی کتاب سے ایک ایسا اقتباس پیش کرتے ہیں جسمیں انھوں نے دوسری تو الگ سید صاحبؒ اور ان کے خاص ماننے والوں پر "کمپنی بہادر" سے سازباز کا الزام لگایا ہے،

تو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے   یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

ہاں! تو مولانا فرماتے ہیں :-

"...... لہذا سید صاحب اور ان کے مجاہدین کو دلی کے مرکز کے تابع ہو کر کام کرنا چاہئے تھا ان کو روپیہ اور آدمی دہلی سے بھیجے جاتے ہیں یعنی سارا مقصد دلی کی آزادی کو مستحکم بنانا تھا مگر اب سید صاحب خلیفہ کہلانے لگے، اور ساری دنیا کی ایک بڑے امیر بن گئے یعنی اگر افغان سرداروں کے لئے ان کی اطاعت مذہبی فرض ہے، تو بخارا ترکی، دوسرے ممالک بھی انکی اطاعت سے سبکدوش نہیں ہو سکتے ...... امیر شہید کو اس طرح امام مہدی کے درجہ کے قریب لانے کی کوشش کی گئی، اس سے مرکز یعنی دہلی کی حکومت جاتی رہی، ہمارے خیال میں اس تمام تر تغیر میں کمپنی بہادر کی ڈپلومیٹک چال کو بڑا دخل ہے۔"

(ص ۹-۱۵۰، حاشیہ)

اس مختصر سی عبارت میں ایسی متعدد باتیں بیان کی گئی ہیں، جن کا مولانا کے دماغ کے سوا کہیں وجود نہیں،

(الف) سید صاحب کا مقصد دہلی کی حکومت کو مستحکم بنانا کبھی نہیں رہا، سید شہیدؒ اور مولانا شہیدؒ کے مکاتیب اور بیانات اس باب میں روز روشن کی طرح نمایاں ہیں، کہاں دلی کی حکومت، اور کہاں تمام اقطار عالم میں احکام رب العالمین کے اجرا کا عزم بلند

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار
فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست

"دلی کی حکومت" کا ذکر ابھی اوپر بھی آچکا ہے،

(ب) سید صاحب یا ان کے ماننے والوں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ تمام دنیائے اسلام

کے امام مطلق تھے، البتہ سرحد کے قیام اور دعوت و تبلیغ کی سرگرمیون سے حلقۂ نفوذ مین وسعت
ضرور ہو رہی تھی،

(ج) "امام مہدی کے قریب لانے کی کوشش کبھی نہین کی گئی" یہ مولانا کا انتہائی مبالغہ ہی،

(د) "اس سے مرکز یعنی دہلی کی حکومت جاتی رہی"۔

گویا مولانا یہ کہنا چاہتے ہین، کہ ۱۸۲۲ء اور ۱۸۲۶ء کے دوران مین مرکزی حکومت کی کچھ
اہمیت باقی رہ گئی تھی،؟ اہل علم بتائین، کہ یہ بیان کہان تک حقیقت سے تعلق رکھتا ہے؟ تاریخ
تو ہمین بتاتی ہے، کہ دلی کی مرکزیت شاہ عالم (۱۱۷۳ھ/۱۷۵۹ء - ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء) ہی کے زمانہ مین ختم ہو چکی تھی،
اکبر شاہ ثانی (۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء - ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء) کے دور مین تو دلی کی حکومت بالکل برائے نام رہ گئی تھی، اور
لال قلعہ کی وقعت ایک امیر کی حویلی سے زیادہ نہین تھی، (ملاحظہ ہو تاریخ ہند ہاشمی جلد سوم ص ۲۰۱)

(ہ) یہ سب باتین تو غلط تھین ہی، لیکن مولانا کا در پردہ یہ فرمانا کہ "مجاہدین کو کمپنی بہادر نے
استعمال کیا" یا یہ کہ سید صاحب کی امامت اور بیعت مین کمپنی بہادر کو دخل تھا، سراسر بہتان ہے آخر
"اس تمام تر تقریر" سے مولانا کی مراد ہو کیا سکتی ہے؟ سید صاحب کا دلی کے مرکز کے تابع نہ ہونا یا ان کا
امیر المومنین منتخب ہونا، اس کے علاوہ تو اور کوئی بات اوپر نہیں کہی گئی ہو، اللہ جانتا ہے، (اور مولنا
اس حقیر سے زیادہ بہتر جانتے ہین) کہ اس بیعت اور اجتماع کلمہ مین کمپنی بہادر کو ادنی دخل بھی نہین تھا، سچی
بات یہ ہے کہ سید صاحب اور ان کے سرفروش مجاہدون پر اس سے زیادہ اور کوئی ظلم نہیں ہو سکتا،

لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ مولنا نے آخر ایسی بات کہی کیونکر؟ تو اس کے متعلق بھی صاف
صاف عرض کردون، بہت سی باتین ہر موقع پر نہین کہی جاتین، مگر اب وقت آگیا ہے، تو سن لیجئے،
کمپنی بہادر کی چال صرف اتنی تھی، کہ ۱۲۴۱ھ/۱۸۲۶ء اور ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ء تک اور پھر سید صاحب کی شہادت
(۱۲۴۷ھ) کے بعد بھی الحاق پنجاب ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۹ء تک اوس نے آدمی اور روپے کی فراہمی مین کوئی روک ٹوک

نہین کی، ہنٹر لکھتا ہے، کہ "بعض کارخانون کے مسلمان ملازمین چھٹی لیکر جہاد کو جایا کرتے تھے"[۱] مولنا
محمد اسحاق کو ایک مہاجن سے جہادیون کی امدادی رقم جو اوس نے غبن کر لی تھی، عدالت سے دلوائی
گئی،[۲] مقصود یہ تھا کہ مجاہدون اور سکھوں کی معرکہ آرائی مین کچھ سرکار عالی کا فائدہ ہی ہو رہے گا،[۳]
لیکن جونہی پنجاب کا الحاق ہوا (۱۸۴۹ء) کمپنی اور سرکار کی نگاہ مین مجاہدین سے برا کوئی نہین
تھا، اور پھر کوئی کسر نہیں تھی، جو انہین کچلنے کے لئے اٹھا رکھی گئی ہو، اور یہی سخت جان لوگ تھے
جو ان حالات مین چالیس سال تک حکومت کا مقابلہ کرتے رہے،[۴]

یہ ہی مولنا کے الزام کی حقیقت جو صاف صاف بیان کر دی گئی، لیکن مولنا اسی الزام
کو دوسری جگہ اس طرح دہراتے ہین، کہ اسکی کوئی توجیہ نہین ہوتی، وہ سید صاحب اور مولینا
اسمٰعیل شہید کے جان نثارون کو کمپنی بہادر کا آلۂ کار بتاتے ہین، اگر کوئی دوسرا اس قسم کی بے بنیاد
بات کہتا تو اس کی ناواقفیت اور تعصب پر محمول کرکے صبر کر لیتے، لیکن اگر سید شہید کے اصحاب خاص
پر مولنا سندھی کمپنی سے سازباز کا الزام لگائین تو بتایئے کہ صبر کے لئے پتھر کا کلیجہ کہان سے لایا جائے
فالی اللہ المشتکی،

"...... فکان ما کانت) الحرب بینھم — تو مجاہدین اور مسلمانان پنجاب کے خود ساختہ)
وبین المتغلبین علی مسلمی الضنجاب — ظالم حاکمون کے درمیان لڑائی برابر کی

---

[۱] Sir Syad Ahmad on Dr. [illegible] The Indian Musalmans
Hunters our Indian Mussalmans مطبوعہ لندن ۱۸۷۲ء ص ۲۱-۲۲،
[۲] اب اگر سکھون اور مجاہدین ہند کی باہمی معرکہ آرائی سے واقعی کمپنی بہادر کو کچھ فائدہ پہونچا تو اس کا الزام سکھون اور
انکی ظالمانہ روش پر عائد ہوتا ہی۔ [۳] ملاحظہ ہو: (۱) سیرت سید احمد شہید باب چہارم (۲) تواریخ عجیب (مولوی محمد جعفر تھانیسری)
(۳) تذکرہ صادقہ (مولانا عبدالرحیم صادق پوری) (۴) ہنٹر کی The Indian Mussalmans (۵) ٹیلر
(Taylor) کی Thirty Eight Years in India وغیرہ وغیرہ۔

(؟ فنجاب) سجال (؟ سجلا) حتی
اندھش منھم رؤساء الجمعیۃ التجاریۃ
الانکلیزیۃ فاستعانوا بالمسلمین
المخالفین للولی اللھیین وامدوھم
بالاموال فوصلوا الی بلاد الافاغنۃ
فاوقعوا الشقاق بین الھندیین النجاحیین
وبین الافاغنۃ الوطنیین،
(ص ۱۴۰ بحوالہ کتاب التمہید،)

رہا کی، تا آنکہ کمپنی بہادر کے اہلکاروں کے
دل میں کھٹک پیدا ہوئی، اس لئے انھون
نے ان مسلمانون سے کام لیا، جو ولی اللّٰہیون
کے مخالف تھے، اور اون کی روپیون سے
امداد کی، تو یہ لوگ افغانون کے ملک
مین آئے، اور انھون نے ہندی مہاجرون
اور ملکی افغانون کے درمیان فتنہ وفساد
کی آگ بھڑکا دی،

آپ سمجھے یہ سرکار کمپنی کے آلہ کار کون تھے، بڑے بڑے عالم متبع سنت جہاد کے شیدائی شوکانی اور مولینا شہید کے شاگرد اور پھران پر یہ الزام کیون تراشا گیا، اس لئے کہ وہ حنفی نہیں تھے، ائمہ حدیث کے مسلک کے مطابق رفع یدین اور آمین بالجہر کرتے تھے، اور مولینا کے خیال مین ولی اللّٰہیوں کے مخالف بھی تھے، ہمارے وہم مین بھی یہ بات نہین آئی تھی کہ حنفیت کی عصبیت ایک وسیع النظر عالم کو ایسی غلط بیانیون پر آمادہ کر سکتی ہے، ہم یہ نہین کہتے، کہ سید صاحب معصوم تھے، یا ان کے سرفروش اہلحدیث جان نثارون سے کوئی غلطی نہین ہوئی، اور نہ یہ کہتے ہین، کہ ان میں سے گرم لوگون نے افغانی علاقہ مین عمل بالحدیث پر اصرار کرکے اگر یہ واقعہ ہے مصلحت شناسی کا ثبوت دیا، لیکن ہم یہ ضرور کہتے ہین، اور پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہین، کہ سید صاحب اور ان کی جماعت کے مخصوص اور با اثر اصحاب کا دامن کسی اجنبی حکومت کے ساتھ سازباز سے یکسر پاک رہا ہے،

ہندوستان کے عاملین بالحدیث سے مولنا بہت رنجیدہ ہین، اس پر اطمینان سے گفتگو ہوگی،

ابھی تو سید صاحب ہی پر اعتراضات کا سلسلہ جاری ہے،

"ہندوستانی انقلاب کی جو خصوصیت اس تحریک کے ذاتیات مین داخل تھی، وہ تقلید کمزور ہوتی گئی یعنی ماوراے سندھ کا مرکز مستقل بن کر دہلی سے سرکشی اور بغاوت کر رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حزب ولی اللہ کی حکومت کا طریقہ بورڈ کی حکومت سے شخصی امامت (ڈکٹیٹر شپ) مین تبدیل ہوگیا، اس طرح امیر شہید امیر المومنین اور دنیاے اسلام کے مصلح خلیفہ مانے گئے" (ص ۱۵۰-۹)

ان طنزیات کا نمونہ اوپر گذر چکا ہے، البتہ سرکشی اور بغاوت کے میٹھے بول قابل توجہ ہین، رہی ڈکٹیٹر شپ اور شخصی امامت تو یہ سید صاحبؒ اور ان کے وزیر شہیدؒ کی اپنی ایجاد نہین، اگر یہ ایسی ہی ناقابل قبول اور گردن زدنی چیز ہے، تو پھر سید صاحب نے کون سا قصور کیا ہے، خلافت راشدہ اور شیخین رضی اللہ عنہما ہی کو ہدف ملامت بنانا چاہئے، "باقی امیر المومنین" اور "مصلح خلیفہ" کے طعنے تو افسوس کہ یہ شیخ الہند کے شاگرد اور "حکمت ولی اللّٰہی" کے شارح و مفسر کی زبان سے اچھے نہین معلوم ہوتے، ہم نیازمندون کی کیا مجال کہ جواب مین کچھ عرض کر سکین،

قومی ھم قتلوا امیم اخی   فاذا رمیت یصیبنی سھمی

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ڈکٹیٹر شپ (؟ امامت) کی مولینا نے ایک اور توجیہ پیش کی ہے :-

"اس کے بعد (ہند کی بیعت کے بعد) ایک سال تک مولینا عبد الحیؒ (ت ۱۲۴۳ھ) زندہ رہے، انکی موجودگی مین کوئی فتنہ پیدا نہین ہوا، سید احمد شہید ان کے سامنے اپنی ذاتی راے پر عمل نہیں کر سکتے تھے، بلکہ اجتماعی فیصلہ حکومت کر رہا تھا،" (ص ۷-۱۵۶)

اگر سید صاحبؒ کسی مسئلے مین بھی اپنی ذاتی راے پر عمل نہیں کر سکتے تھے، تو ان کی بیعت ہی اجماع ایک لغو فعل تھا، اور مولانا عبد الحیؒ نے بیعت کرنے مین سخت غلطی کی تھی، اسلام مین شوریٰ

کی تاکید ضرور ہے، لیکن امام بہر حال مجلس شوریٰ کی رائے کا پابند نہیں، کیا مولینا عبد الحیٔ بڈھانوی جیسا عالم متبحر اتنی سادہ حقیقت بھی نہیں جانتا تھا، سچی بات یہ ہے کہ مولینا سندھی کی اس قسم کی توجیہوں کی زد صرف سید صاحب ہی پر نہیں، بلکہ اُن کے حزب ولی اللٰہی کے خاص ارکان پر بھی پڑتی ہے۔

اور مولنا عبد الحیٔ کے اس اثر و نفوذ کی تائید میں حسب ذیل قصہ دہرایا گیا ہے :-

سید احمد شہید ایک روز صبح کی نماز میں دوسری رکعت میں آکر شریک ہوئے، نماز سے فارغ ہو کر مولانا عبد الحیٔ نے ما بال اقوام الخ کے طور پر فرمایا کہ ایسے لوگ جو سنت کے احیاء کے مدعی ہیں، وہ جماعت میں بھی صحیح طور پر حاضر نہیں ہو سکتے، سید صاحب نے فرمایا، مولانا! آپ کا یہ ارشاد حق ہے اور ہم سے پھر ایسی کوتاہی نہیں ہوگی اور یہ آپ کا فرض ہے، کہ آپ اس طرح ٹوکیں، مولنا عبد الحیٔ نے کہا کہ یہ عذر صحیح نہیں ہے، آپ کو صحیح طور پر کام کرنا چاہئے، ہر روز کون ٹوک سکتا ہے، ؟ امام بنتے ہو تو آگے بڑھ کر کام کرو۔"[2]

پہلے اس قصہ کے آخری فقرون کا تیور ملاحظہ ہو، اس کے بعد مصنف سیرت سید احمد شہید کا یہ بیان جو اپنی جگہ پر کافی وشافی ہے :-

"سید صاحبؒ کی جماعت میں آپ کی وہ حیثیت تھی، جو بلا تشبیہ صحابۂ کرام میں حضرت صدیق اکبرؓ کی، آپ پر شان صدیقیت اور شاہ صاحبؒ پر شان فاروقی غالب تھی، .... امر بالمعروف ونہی عن المنکر میں نہایت چست ومستعد رہتے، اور اس میں اپنے شیخ کا بھی جس سے زیادہ محترم ہستی آپ کی نظر میں کوئی نہ تھی، لحاظ نہ کرتے، ایک مرتبہ شادی کے بعد سید صاحبؒ کو خلاف معمول جماعت میں کچھ تاخیر ہو گئی، دوسرے دن پھر اتنی تاخیر ہوئی کہ

[1] خود شاہ عبد العزیز صاحب انھیں شیخ الاسلام کے لقب سے یاد کرتے تھے، (سیرت سید احمد شہید ص ۲۱۵)

[2] اصل میں فقرے خط کشیدہ نہیں،

تکبیر اولیٰ فوت ہو گئی، مولانا نے سلام پھیرنے کے بعد کہا کہ عبادت الٰہی ہو گی یا شادی کی عشرت، سید صاحب خاموش ہو گئے، اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا، دیوبند میں ایک مرتبہ کسی وجہ سے صبح کی نماز میں سید صاحبؒ کی تکبیر اولیٰ فوت ہو گئی، اس دن مولانا عبد الحیٔ نے اسی کا وعظ فرمایا، ایک مرتبہ سید صاحب نے فرمایا کہ اگر مجھ سے کوئی بات خلاف سُنّت دیکھئے، تنبہ کر دیجئے گا، مولانا نے فرمایا، کہ حضرت! جب کوئی مخالف سُنّت فعل آپ سے عبد الحیٔ دیکھے گا، تو وہ آپ کے ساتھ ہو گا ہی کہاں، .... (ص ۱۹۳ طبع دوم)

اوپر مولانا ابو الحسن علی حسنی نے بھی مولانا عبد الحیٔؒ کے احتساب کے تین واقعے بیان کئے، لیکن کہین وہ تلخی نہیں، جو مولانا سندھی کی روایت مین ملتی ہے، اور پھر لہجے کی تلخی، مندرجۂ ذیل واقعہ پڑھکر اور بھی بعید معلوم ہوتی ہے، مولنا سندھی کی روایت ہے[1] :-

"جب مولنا عبد الحیٔ کا آخری وقت تھا، تو سید صاحب نے اُن سے فرمایا، کہ مولانا آپ کی اگر کوئی خواہش ہو، تو مین اس کو پورا کر دون آپ نے کہا آپ اپنا قدم بڑھا کر میرے سینے پر رکھین یہی ایک خواہش باقی ہے، سید صاحب نے اس کی تعمیل کر دی، الغرض ادب بھی انتہا درجہ کا ملحوظ ہے، اور ان کو قاعدے کے اندر پابند رکھنے کی قوت بھی ہے"

(حاشیہ ص ۱۵۸)

اب یہی واقعہ سید صاحبؒ کے مستند سیرت نگار کی زبانی ملاحظہ ہو :-

"انتقال کے وقت سید صاحب سے فرمایا، کہ حضرت شہادت تو میری قسمت میں نہ ہوئی اب اتنی تمنا ہے کہ آپ اپنا قدم مبارک میرے سینہ پر رکھ دیجئے کہ اسی حالت میں میری جان

[1] یہ ہر دو واقعے ہمیں مولنا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے سنائے، غالباً انھون نے مولانا محمد قاسمؒ یا مولینا رشید احمدؒ سے سنے ہوں گے، (ص ۱۵۸ حاشیہ)

نکل جائے، سید صاحب نے فرمایا کہ میرا پاؤن اس قابل کہان ہے، کہ اُس سینہ پر رکھون جو قرآن و حدیث کے علم کا خزینہ ہے، آپ نے تسلی کے لئے اپنا ہاتھ آپکے سینہ پر رکھ دیا، اور اسی حالت مین آپ کا انتقال ہوگیا، (سیرت سید احمد شہید ص ۳۲۲)

دیکھئے دونون روایتون کی زبان مین کتنا فرق ہے، بہر حال ہمین ان روایتون کی صحت سے انکار نہین، (البتہ مولینا سندھی کی روایت مین بعض فقرے بعید معلوم ہوتے ہین)، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مولنا عبد الحیٔ رح کی وفات کے بعد سید صاحب بے قابو ہوگئے، بالکل غلط ہے، آخر مولنا شہیدؒ تو آخری لمحۂ حیات تک ساتھ ہی رہے، (جن پر بقول ابو الحسن علی شان فاروقیت غالب تھی)،

مولانا ایک طرف تو سید صاحبؒ کی امارت و امامت سے برہم ہین، (جیسا کہ ابھی آپنے دیکھا)، دوسری طرف انعقاد بیعت کی تاریخ کو وہ "شمسی قومی نوروز" بھی منانا چاہتے ہین، فرماتے ہین:-

"۱۲۴۱ھ مین ہجرت شروع ہوئی، اور ۱۲ جمادی الاخری ۱۲۴۲ھ (۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء) کو افغانی قبائل نے بھی ہندؔ مین سید احمد کو اپنا امیر مان لیا، (ص ۱۵۶)

ہنڈ پر حاشیے مین لکھتے ہین :-

ہنڈ کا تعلق ہماری سیاسی تاریخ سے نہایت قوی ہے، یہ ہنڈ وہی مقام ہے، جہان ۱۲ جمادی الاخرہ ۱۲۴۲ھ کو "فرقہ ولی اللّٰہیۃ" کے مقدمۃ الجیوش نے جسے امام عبد العزیز دہلوی نے تیار کیا تھا، اپنی حکومت موقتہ قائم کی، اس کے رئیس امیر شہید دہلوی (؟ بریلوی) تھے، جمہور مسلمین نے بیعت کی اور انھین امیر مان لیا گیا، اتفاق سے یہ تاریخ ۱۰ جنوری ۱۸۲۷ء[1] کے موافق تھی،

[1] ہم ابھی اوپر لکھ آئے ہیں کہ ۱۲ جمادی الاخرہ ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کے مطابق ہوتی ہے، (تقویم ہجری و عیسوی) سیرت نگارون نے دن کی تعیین نہین کی، اس لئے یقین کے ساتھ ان دونون تاریخون مین کسی ایک کو ترجیح نہین دیجا سکتی قمری مہینون کی مطابقت مین یہ فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

اس لئے ہمارا شمسی قومی نوروز اس واقعے کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ۱۰ جنوری کو منایا جائے گا،

جس قدر ہندوستانی مسلمانوں کی قومی روح پیدا ہوگی، اسی اندازے سے وہ ہماری تجویز کی تائید کرین گے،" (ص ۱۵۷)

اس ارشاد گرامی کا خلاصہ ان دفعات مین کیا جا سکتا ہے :-

(۱) سید صاحبؒ کی امارت مان لی گئی،

(۲) انعقاد بیعت کی تاریخ نہایت اہم بالشان اور وہ دن ایک تاریخی دن ہے،

(۳) شمسی قومی نوروز منایا جائے،

(۴) ہندوستانی مسلمان مین قومی روح پیدا کرنے کی ضرورت ہے،

کاش! مولنا ہمین بتاتے کہ امام ولی اللّٰہ نے کس کتاب مین "شمسی قومی نوروز منانے" کی تلقین کی ہے، یا اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے،؟ دوسری بات یہ عرض کرنا تھی، کہ سید صاحبؒ کی امارت مطلقہ "(یعنی اندرون ہند کی نگرانی سے آزاد) تو غلط تھی، پھر ان کے انعقاد بیعت کا دن اتنا اہم کیون قرار دیا جا رہا ہے،؟

باقی نیشنلزم کے متعلق تو مولنا کا خیال واضح ہو چکا ہے، اس لئے کچھ مزید عرض کرنا بے سود ہے، رہا ایک مسلمان کا نقطۂ نگاہ کیا ہونا چاہئے،؟ تو اسے عارفؒ سیالکوٹیؒ کی زبان سے یون ادا کر سکتے ہین :-

نرالا سارے جہان سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا ۔۔۔ بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہین ہے (اقبال)

اس سلسلے کی ایک اور بات رہ گئی، امام عبد العزیزؒ (ف ۱۲۳۹ھ) کے بعد مسند درس کی جانشینی مولینا محمد اسحاقؒ کو تفویض ہوئی، اس سے مولانا نے شاہ محمد اسحاق صاحب کی امارت مطلقہ پر استدلال کیا ہے[1]،

[1] مولانا فرماتے ہین :- امام عبد العزیز نے سید احمد شہید کے بورڈ کو پہلی دفعہ ۱۲۳۱ھ میں بیعت طریقت

حالانکہ اس سے مدعا ثابت نہین ہوتا، جب سید صاحبؒ کی امامت پر ہندوستان اور ماوراء سرحد کے تمام مجاہدون اور ولی اللٰہیون نے بیعت کرلی، اور شاہ اسحاق صاحب نے اس پر اعتراض نہین کیا، بلکہ برابر آدمی اور روپے سے مدد کرتے رہے، توان کی حیثیت اندرونی ناظم اور وکیل سے زیادہ نہین رہجاتی، جیساکہ خود مولنٰا کتاب التمہید مین اعتراف کرچکے ہین، رہا مدرسہ کا ..... کیا جانا تو اس کی حیثیت ایک مقامی ضرورت کی انجام دہی سے زیادہ نہین ہے، (اور بقول حضرت مولنا ابوالکلام مدظلہ مدرسون اور حجرون کا کام تو ہر کوئی کرلیتا ہے، لیکن میدان والا کام کم لوگون سے بن آتا ہی، او کما قال فی کتابہ تذکرہ) اس سے شاہ محمد اسحاقؒ صاحب کا علمی مرتبہ ضرور معلوم ہوتا ہے، جس مین کسی چون وچرا کی گنجایش نہین، اور اگر صرف مسند درس کی جانشینی امارت وامامت پر دلالت کرتی ہے، تو مولنٰنا کیا فرمائین گے، میان صاحب مولنٰا سید نذیر حسین محدث (سورج گڈھی مونگیری) دہلوی (ف ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء) کی امامت کے بارے مین؟ شاہ محمد اسحاق صاحب کی ہجرت (شوال ۱۲۵۸ھ) کے بعد میان صاحب ہی جانشین ہوئے، اور انھون نے مسلسل ایک عرصۂ دراز تک مسند ولی اللٰہی پر[1] درس دینے کی عزت حاصل کی، پھر آپ شاہ اسحاق

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵) لینے کے لئے اور دوسری دفعہ ۱۲۳۶ھ مین بیعت جہاد لینے کے لئے دورہ پر بھیجا اس کے بعد سارے قافلہ سمیت حج پر جانے کا حکم دیا تا کہ ان کی تنظیمی قوت کا تجربہ ہوجائے، جب قافلہ حج سے ۱۲۳۹ھ مین واپس آیا، تو امام عبدالعزیز فوت ہوچکے تھے، انھون نے آخری وقت مین مولانا محمد اسحاق کو مدرسہ سپرد کرکے اپنا قائم مقام بنادیا تھا" (ص ۱۵۳) [1] مولنا شاہ صاحبؒ مدرسہ کو ولی اللہ کالج کہنا پسند کرتے ہین، (حاشیہ ص ۳۳ ص ۵) پتہ نہین کالج کے لفظ مین کیا جادو ہی؟ کہ ہمارے اکابر بھی اس سے مسحور ہین، آگے بڑھکر (ص ۴۳ حاشیہ) شاہ محمد اسحاق صاحب (ف ۱۲۶۲ھ) کی ہجرت (۱۲۵۸ھ الحیات بعد الممات ص ۵۲) کے بعد میان صاحب کی جانشینی کا تذکرہ بالکل نظر انداز کردیا گیا ہی جانے کیون مولانا اہل حدیث عالمون سے اتنے بیزار ہین؟

صاحب کے بعد امارت اور اپنے حزب ولی اللٰہی کی قیادت، حاجی امداد اللہ صاحب (ف ۱۳۱۷ھ) کو کیون سونپتے ہین، ؟ گویا آپ خود اعتراف کرتے ہین، کہ مسند درس کی جانشینی حزب کی امامت وامارت کے لئے کافی نہین،

سید شہیدؒ کے ساتھ مولانا ان کے تذکرہ نگارون اور ثناخوانون سے بھی برہم ہین جس کا کوئی شکوہ نہین، البتہ رنج اس بات کا ہے، کہ کہین کہین ان مخلصون پر بیجا حملے کیے گئے ہین، (ص ۸)، مین مولانا نے شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے مشہور خواب کا ذکر کیا ہے، اور شارح نے کتاب التمہید کی عبارت کے ساتھ سیرت سید احمد شہید (ص ۴۲، طبع دوم) سے بھی مندرجۂ ذیل سطرین نقل کی ہین :-

صبح اٹھکر شاہ صاحب، سب سے پہلے حضرت شاہ غلام علی مجددی مظہری خلیفہ حضرت مرزا مظہر جان جانان رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین تشریف لے گئے، اور خواب کی تعبیر چاہی، شاہ غلام علی نے فرمایا، .... کہ اس خواب سے معلوم ہوتا ہے، کہ آپ کے ذریعہ (یا آپ کے کسی مرید[1] رشید) کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت وفیض کا سلسلہ جاری ہوگا (ق)

اسکے بعد شارح مولوی نورالحق صاحب علوی فرماتے ہین، :-

"مولانا الشیخ عم فیضہم نے مجھے ۲۶ رجون ۱۹۴۰ء کو فرمایا کہ یہ خواب امام عبدالعزیز کی عظمت پر دال ہے، کہ اُن کے عہد مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک رسائی بغیر آپ کے ممکن نہ تھی، رہا فقرہ محصورہ بین الخطین، ہمارا خیال ہے کہ یہ فقرہ شاہ غلام علیؒ کے ذمہ لگاکر محض اس لئے بڑھایا گیا، کہ سید امیر شہید کی نفضیلت ثابت کیجا سکے، ورنہ اصل خواب سے اس کو کوئی تعلق نہین ہے"۔

آپ نے دیکھا پہلے "یا آپ کے کسی مرید رشید" والے فقرے کو بین الخطین کیا گیا، اس کے

[1] سیرت سید احمد شہید مین یہ فقرہ بین الخطین نہین ہے (طبع دوم ص ۴۲، طبع اول ص ۶۸)

بعد ارشاد ہوا کہ فقرہ محصورہ بین الخطین بعد کا اضافہ ہے، سبحان اللہ!!! اعتراض کی کیا دلچسپ صورت نکالی گئی ہے،

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" شاید اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ فقرہ مذکورہ بعد کا اضافہ نہیں ہے، سیرت سید احمد شہید کے مصنف نے یہ واقعہ غالباً مخزن احمدی سے لیا ہے، جو سید صاحب کے بڑے بھانجے (اور ان سے عمر میں بڑے) اُن کے خلیفہ اور رفیق سفر مولوی سید محمد علی صاحب (ف ۱۲۶۶ھ) کی تصنیف ہے، (سال تصنیف ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء) بہر حال انھوں نے جہاں سے بھی لیا ہو یہ واقعہ مخزن احمدی میں بعینہ مذکور ہے، جو سید صاحب کے ابتدائی حالات میں سب سے بڑا ماخذ ہے، ملاحظہ ہو:-

"........ صبح گاہان امام المحدثین بملاقات حضرت سید غلام علی صاحب کہ از خلفائے حضرت شمس الدین شہید کہ مشہور بہ مرزا مظہر مرحوم اند رفتہ این رؤیا بیان نمودہ تعبیرش خواستند۔ سید علیہ الرحمۃ بعد تحیر بیان آوردہ فرحان و خندان فرمودند کہ صاحب در ذہن ناقص چنان معلوم می شود کہ ارادت حضرت سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم بجلائی از ذوات حضرت سید حسن رسول نما کہ مدت یکصد و پنجاہ سال گذشتہ موقوف و مسدود است اینک این حالت غریبہ از دست شما یا یکے از مریدان شما ظاہر و منتشر خواہد شد......"

(مخزن احمدی (قلمی) ورق ۲۸، الف و ب مخطوطہ مشرقی کتاب خانہ پٹنہ نمبر ۱۳۸۵)

ہم نہیں سمجھتے کہ مولوی سید محمد علی صاحب نے یہ فقرہ (یا یکے از مریدان شما) اپنی طرف سے تصنیف کیا ہوگا، کم سے کم سید صاحب کے خلفا، اور رفیقوں کے بارے میں ہم ایسی بدگمانی نہیں کرتے،

تذکرہ نگاروں کا ذکر خیر ایک دوسرے موقع پر اس طرح کیا گیا ہے:-

"ہمارے زمانہ کے مورخین نے اس تحریک کے بیان میں بہت غلطیاں کی ہیں، وہ سید صاحب

کا تعلق امام عبد العزیز سے کاٹنا چاہتے ہیں، اور امیر شہید کو ایک مہدی منتظر کے درجہ پر دیکھنا چاہتے ہیں، (ص ۱۱۵)

"ہمارے زمانہ کے سیرت نگار مولانا ابو الحسن علی حسنی ندوی کی مقبول کتاب سیرت سید احمد شہید پڑھکر ہر شخص یہ فیصلہ کر سکتا ہے، کہ انھوں نے امام عبد العزیز سے سید صاحب کے تعلق کاٹنے" کی کوئی ادنیٰ سی بھی کوشش کی ہے،؟ (ملاحظہ ہو، سیرت سید احمد شہید ص ۵۰-۵۳) اور ہمارے زمانے سے پہلے کے تذکرہ نگار مولوی سید محمد علی صاحب اور مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری اسیر پورٹ بلیر و متہم مقدمہ سازش انبالہ ۱۸۶۴ء کی کتابیں موجود ہیں، ہر منصف مزاج پڑھکر فیصلہ کر سکتا ہے، کہ مولانا کا یہ الزام کہاں تک صحیح ہے،؟ "مہدی منتظر" کا افسانہ سراسر مبالغہ آرائی پر مبنی ہے، جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں،

سید صاحب کے متعلق یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ انھوں نے درسیات کی تکمیل نہیں کی تھی انھیں دینی علوم سے ضروری واقفیت تھی، اس سے کسی نے انکار نہیں کیا، (سیرت سید احمد شہید ص ۵۰) لیکن بدگمانی کا برا ہو، مولانا اس سے بھی غلط نتیجہ نکالتے ہیں:-

"......اس طرح پر ہم سید صاحب کو ایک عالم مانتے ہیں، ان کے مناقب لکھنے والے دھوکہ دیتے ہیں، کہ وہ پڑھے لکھے نہ تھے، بلکہ سب چیزیں کشف سے ان کو حاصل تھیں ان کی خواہش در اصل یہ ہے، کہ سید صاحب کا جو تعلق تلمذ شاہ عبد العزیز سے ہے، وہ کاٹ دیا جائے اور وہ ایک امام مہدی کے طور پر مانے جائیں، ان لوگوں نے اس تحریک کو بڑا نقصان پہونچایا، (ص ۱۴۴)

مولانا فرماتے ہیں، کہ "ان کے مناقب لکھنے والے دھوکا دیتے ہیں، کہ وہ پڑھے لکھے نہ تھے"

اچھا تو سنئے، سید شہید کے وزیر و مشیر اور تتمہ دودمان ولی اللّٰہی، حضرت مولانا اسماعیل شہید

وجہہ یوم القیامۃ) فرماتے ہیں:-

"......اگرچہ احسن و اولیٰ در تالیف این کتاب چنان می نمود کہ بطوریکہ در تحریر اکثر مضامین این کتاب محض بر ترجمہ انچہ از زبان ہدایت نشان حضرت ایشان صدور یافتہ بود اکتفا کردہ شد در تمامی مضامین ہمان راہ پیمودہ می شد لیکن ازینکہ نفس عالی حضرت ایشان بر کمال مشابہت جناب رسالت مآب علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات در بدو فطرت مخلوق شدہ بناءً علیہ لوح فطرت ایشان از نقوش علوم رسمیہ و راہ دانشمندان کلام و تقریر و تحریر مصفی ماندہ بود ......الخ (دیباچہ صراط مستقیم: ص ۴)

بتایئے، کیا مولانا شہید بھی دھوکا دے رہے ہیں؟

اب ایک آخری جملہ ملاحظہ ہو، حزب ولی اللہ کا پہلا دور ختم کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

"ایک حقیقت ہے کہ واقعہ بالاکوٹ پر امام ولی اللہ اور امام عبدالعزیز کی اجتماعی تحریک کا ایک دور ختم ہو گیا، لیکن چالاک تاریخ نویس اس واقعہ کو خود تحریک کا خاتمہ قرار دینا چاہتا ہے، وہ پہلے امیر شہید کی عظمت پر زور دے کر ان کو ساری تحریک کا ماں باپ ثابت کرتا ہے، اس کے خیال میں اس تحریک کی اس قدر کامیابی میں نہ امام عبدالعزیز کا دخل تھا، اور نہ امام ولی اللہ کا، اور نہ پشاور کی حکومت موقتہ کو دہلی میں مولانا محمد اسحاق کی امامت یا صدارت سے (جو روپیہ اور مجاہدین پہنچانے کی ذمہ دار تھی) کوئی تعلق تھا، اس کے بعد وہ آسانی سے امیر کی شہادت سے تحریک کے ختم ہونے کا نتیجہ نکال لیتے ہیں۔" (ص ۱۷۵)

(الف) چالاک تاریخ نویس" مشہد بالاکوٹ کو تحریک کا خاتمہ اس معنی میں قرار دیتا ہے، کہ احیائے نظام خلافت راشدہ (حکومت دہلی کی تجدید نہیں) کی ایک منظم اور ہمہ گیر کوشش جو حضرت سید شہید کی قیادت میں ہو رہی تھی، ظاہراً ناکام رہی، اور فوری طور پر اس نہج پر دوسری ہمہ گیر تحریک اٹھانے کی توقع بھی جاتی رہی، ورنہ سید شہید کے ماننے والے اس المناک واقعے کے بعد بھی عرصۂ دراز تک اسی مقصد عظیم کے لئے جان اور سر کی بازی لگاتے رہے، اور آج بھی ایک جماعت آیۂ ربانی

وَمِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا (الاحزاب: ۳۳)	ان مومنین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا، اس میں سچے اترے، پھر بعضے تو ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے ہیں، اور بعضے ان میں مشتاق ہیں، اور انھوں نے ذرا تغیر (ترجمہ شیخ الہند)

کی یاد تازہ کر رہی ہے۔

(ب) امام ولی اللہؒ اور امام عبدالعزیزؒ کی تجدیدی کوششوں کا کس نے انکار کیا؟ البتہ محققین امام ولی اللہؒ اور امام عبدالعزیزؒ کے درمیان فرق کرتے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ ہندوستان میں اسلامی تجدید کا سہرا مجدد الف ثانیؒ (ف ۱۰۳۴ھ) شاہ ولی اللہؒ (ف ۱۱۷۶ھ) اور مولانا اسمٰعیل شہید (ف ۱۲۴۶ھ) کے سر باندھتے ہیں، مولانا آزاد کو تمام جہادی سرگرمیوں میں مولانا شہید ہی کی روح کار فرما نظر آتی ہے[1]، استاذ محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ (حضرت مجدد سرہندی اور امام ولی اللہؒ کے بعد) حضرت سید احمد شہیدؒ بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید دونوں بزرگوں کو "تجدید دین کی نئی تحریک" کا امام سمجھتے ہیں:-

"تیرہویں صدی میں جب ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی، اور دوسری طرف ان میں مشرکانہ رسوم اور بدعات کا زور تھا، مولانا اسمٰعیل شہید اور

[1] راقم نے ایک مرتبہ (۱۳۳۵ھ) میں مولانا آزاد مدظلہ سے عرض کیا، کہ یہ مقام تجدید تو حضرت سید صاحبؒ کا منصب ہے، مولانا شہیدؒ بہرحال ان کے مرید تھے، مولانا نے فرمایا کہ "میرا تاثر وہی ہے"۔

حضرت سید احمد بریلوی کی مجاہدانہ کوششون نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی، یہ وقت تھا جب سارے پنجاب پر سکھون کا اور باقی ہندوستان پر انگریزون کا قبضہ تھا، ان دونون بزرگون نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھایا، اور مسلمانون کو جہاد کی دعوت دی ....."

(مقدمہ سیرت سید احمد شہید)

ہندوستان مین اسلامی تجدید پر یہ مقدمہ بے مثال چیز ہے، لیکن اس مین کہین شاہ عبد العزیز صاحب کا نام مجدد یا مفکر کی حیثیت سے نہین آیا، مولانا ابو الکلام اور کھل کر اپنے مخصوص انداز بیان مین رقمطراز ہین:-

"...... پھر کیا اس وقت ہندوستان علم وعمل سے خالی ہو گیا تھا؟ ...... خود اس خاندان عالی مین کیسے کیسے اکابر واساتذۂ علم وعمل موجود تھے؟ حضرت شاہ عبد العزیز کے درس وتدریس کی بادشاہت سمرقند وبخارا اور مصر وشام تک پھیلی ہوئی تھی، شاہ عبد القادر، اور شاہ رفیع الدین علم وعمل کے آفتاب تھے، ...... باین ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ جو وقت کا ایک سب سے بڑا کام تھا، اس کے لئے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی، سب دوسرے کامون مین رہ گئے، یا حجرون کا کام یا مدرسون کا، لیکن میدان والا معاملہ کسی سے بھی بن آیا، ......"

(ملاحظہ ہو تذکرہ ص ۲۷۳ ۲۷۲ ۲۷۴)

اسی طرح مولانا ابو الاعلیٰ مودودی بھی اپنے مقالہ تجدید واحیاے دین (الفرقان ولی اللہ نمبر ص ۱۰۰-۹) مین شاہ عبد العزیز صاحب کی امامت کا بالکل ذکر نہین کرتے، (البتہ ان کے حلقہ تدریس کی عظمت کا شاندار الفاظ مین اعتراف کرتے ہین) اور ان دونون شہیدون کو شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتے ہین:-

"یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ صاحب) کی وفات پر پوری نصف صدی

بھی نہ گذری تھی کہ ہندوستان مین ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا، جو شاہ صاحب نگاہون کے سامنے روشن کر گئے تھے، سید صاحب کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ شہید کے منصب امامت، عبقات، تقویۃ الایمان اور دوسری تحریرین دیکھئے، دونون جگہ وہی شاہ صاحب کی زبان بولتی نظر آئے گی۔ ...... سید صاحبؒ اور شاہ صاحبؒ (مولانا اسمٰعیل شہیدؒ) دونون روحاً ومعنًی ایک وجود رکھتے ہین، اور اس وجود متحد کو مین مستقل بالذات مجدد نہین سمجھتا، بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہون، ......" ص ۹۲ تا ۹۲

اب آپ بتائین کہ وہ کون "چالاک تاریخ نویس" ہے، جو اس سے زیادہ کچھ کہتا ہے؟ سید صاحبؒ کے تذکرہ نگار تو حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کو ان کا پیر اور استاد تسلیم کرتے آئے ہین،

(ج) مولینا محمد اسحاق صاحبؒ کی امامت اور امارتِ مطلقہ البتہ ہمین تسلیم نہین، ہم انھین درس گاہ ولی اللّٰہی کا جانشین اور سید صاحبؒ کی جہادی سرگرمیون مین معاون ومددگار مانتے ہین، اس سے زیادہ کہئے تو ہم آپ ہی کی اصطلاح اور زبان مین حکومتِ موقتہ کا "وکیل" مان لین، روپیہ اور مجاہدین پہنچانے کی ذمہ داری بھی ان کے لئے "وکیل حکومت" ہی کا منصب تجویز کرتی ہے،

(د) رہی "امیر شہیدؒ کی عظمت اور اس پر زور دینے کا سوال" تو یہ کوئی گناہ نہین، اور اگر آپ کے خیال مین یہ گناہ ہے، تو "صدر شہید" اس راہ کے پہلے خطاوار ہین، صراط مستقیم کے دیباچے مین مولانا شہید نے سید صاحبؒ کے نام نامی کے ساتھ تکریم وتوصیف کے جو القاب استعمال کئے ہین، ان سے زیادہ آج تک کسی عقیدت مند نے نہین لکھا ہوگا،:-

"اما بعد میگوید ...... بندۂ ضعیف محمد اسمٰعیل کہ نعم الٰہی دربارہ این ضعیف نامتناہی است و از اعاظم آن حضور محفل ہدایت منزل ملازمان فخر خاندان سیادت مرجع ارباب ہدایت مرکز دائرۂ ولایت دلیل سبیل فلاح ورشاد رہنمائے طریق استقامت وسداد، مظہر انوار نبوی

منبع آثار مصطفوی سلالۂ خاندان صلب طاہر سید الاولیاء اعنی علی مرتضیٰ، نقاوۂ دودمان
سبط اکبر سند الاصفیاء اعنی حسن مجتبیٰ، مقتدائے اصحاب شریعت پیشوائے ارباب طریقت،
ہادی زمانہ مرشد یگانہ سراج المحبین تاج المحبوبین الامام الاوحد السید احمد متع المسلمین بطول
بقائہ ونفعنا وسائر الطالبین باقوالہ واحوالہ واین ضعیف دراوان حضور آن مجلس ملائک انس
باستماع کلمات ہدایات آیات، الخ الخ (صراط مستقیم ص ۸)

ابو الحسن علی ندوی (صاحب سیرت سید احمد شہید) توبہرحال محتاط ہین، مولوی جعفر تھانیسری
جیسے عاشق صادق نے بھی تکریم و توصیف کے اتنے القاب نہین استعمال کئے، ہمیں بتایا جائے کہ وہ
کون "چالاک تاریخ نویس" ہے، جس نے مولانا شہید سے زیادہ سید صاحبؒ کی عظمت پر زور دیا ہے؟
یہان تک تذکرہ تھا حضرت سید صاحبؒ اور ان کے رفقار کا، مولانا سندھی کی تبویب کے
مطابق حزب ولی اللہ کے دور اول کا، اب قلم کا مسافر ذرا دم لینا چاہتا ہے، کتاب کے باقی حصون
پر دوسری نشست مین گفتگو ہوگی، یار زندہ صحبت باقی،

تازہ قلم راقم اوپر لکھ آیا ہے کہ سید صاحبؒ کی بیعت کے موقع پر شیخین (مولانا عبد الحیؒ اور مولانا
اسماعیل شہیدؒ) موجود تھے، اب مزید چھان بین کے بعد یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ مولانا عبد الحیؒ
ہجرت وجہاد مین سید صاحبؒ کے ہمراہ نہیں جاسکے تھے، کسی خدمت کے سرانجام دینے کے لئے وہ
ہندوستان ٹھہر گئے تھے، (سیرت سید احمد شہید ص ۳۲۰) مولانا عبد الحیؒ جنگ سیدو کے بعد سوات
کے علاقہ مین سید صاحب سے ملے، (قُبیل ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ) ہجرت ۱۲۴۱ھ کے آغاز مین شروع ہوئی
اور بیعت شیخون حضرو کے بعد لی گئی، (۱۲ ر جمادی الآخرہ ۱۲۴۲ھ، سوانح احمدی: ص ۱۰۵ وص ۱۰۱)
مولانا عبد الحیؒ کی وفات شعبان ۱۲۴۳ھ مین ہوئی،
گویا مولانا عبد الحیؒ میدانِ جہاد مین سید صاحبؒ کے ساتھ آٹھ نو مہینے سے زیادہ نہین رہے

اب اس قلیل عرصہ مین سید صاحبؒ پر کس قدر حاوی رہے ہون گے، ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے، مولانا
عبد الحیؒ گو بیعت مین شریک نہین تھے لیکن سید صاحبؒ کی امارت مین اور ان کے جھنڈے کے
نیچے برابر جہاد مین مصروف رہے، اور یہ وابستگی آخر دم تک قائم رہی، جیسا کہ سیرت سید احمد شہید سے
معلوم ہوتا ہے، (ص ۲۲-۳۱۵)

(۱۱) مولانا سندھیؒ نے سید صاحب پر استبداد بالرائے، ڈکٹیٹریت اور اس قسم کے دوسرے
الزام لگائے ہین، اور سید صاحبؒ کی "انہی غلطیون" کو ناکامی کا سبب قرار دیا ہے، ہم نے طوالت کے
خوف سے ناکامی کے اسباب پر گفتگو نہین کی، حاشیہ مین اشارہ پر اکتفا کیا ہے، البتہ اتنا لکھدیا ہے
کہ ہم "سید صاحبؒ کو معصوم نہین کہتے" کہین یہ خیال نہ ہو کہ یہ صرف راقم کا خیال ہے، ان کے منقبت
نگار" تو انھین معصوم ہی کہتے آئے ہین، اس شبہہ کے دفعیہ کے لئے مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری
کا یہ بیان کافی ہوگا:

"بوجہ اپنی پاک باطنی اور صفائی قلب اور توکل وزہد اور اولوالعزمی کے اس بےنظیر
بزرگ کو پولٹیکل پیچیدگیون اور علم فن جنگ کی طرف بالکل توجہ نہ تھی، انہی دو نقصون
نے اس کام کو بگاڑ کر آخر اس کو بالاکوٹ مین وہ دن دکھایا کہ جس کی یاد سے آج تک
ہزارون خلقت کے دل دکھتے ہین،......"

(سوانح احمدی ص ۱۳۹)

یہ دو نقص بھی ناکامی کے اسباب مین داخل ہو سکتے ہین، ناکامی کے وجوہ اس سے
زیادہ گہرے ہین، جن سے سید صاحبؒ کے تذکرہ نگارون نے (بہ شمول مولوی محمد جعفر تھانیسری و
مولانا ابو الحسن علی ندوی) سیر حاصل بحث نہین کی، انشاء اللہ پھر گفتگو ہوگی،

قرآن پاک اور علاج غضب[۱]

از

ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لا استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

تا بتوانی خستہ مگردان کس را | بر آتش خشم خویشتن سوز کس را
گر راحت جاودان طمع می داری | می رنج ہمیشہ و مرنجان کس را

(عطار)

انسان کی مادی اور روحانی ترقی مین جو شے سب سے زیادہ مانع و مزاحم نظر آتی ہے، وہ جذبہ غضب ہے! اس آتش فشان جذبہ کے اشتعال کے وقت انسان انسان نظر نہین آتا، بلکہ وہ ایک مہیب غار کا منظر پیش کرتا ہے، جو دخانی آگ سے پُر ہے، جس مین سے سوائے خوفناک آوازون اور جانسوز چنگاریون کے کچھ نہین نکلتا! اسی لئے اہل غضب اپنا نسب شیطان سے ملاتے ہین، کیونکہ اسی نے تو کہا تھا کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَارٍ!

ترا با چنین تندی و سرکشی | نہ پندارم از خاک از آتشی!

ایک غضب ناک شخص کو اعصابی تناؤ کی حالت مین دیکھکر حضرت حسنؓ نے خوب فرمایا تھا کہ "اے شخص تو غصہ مین اتنا اچھلتا ہے، کہ مجھے ڈر لگتا ہے، کہ اب کی اچھال مین تو دوزخ مین جا پڑیگا"!

۱؎ یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے چودھوین سالانہ اجلاس مین پڑھا گیا،

اس قابل نفرت جذبہ کے تسلط کے وقت انسان کی صورت پاگل یا درندے کی سی ہوجاتی ہے، دماغ اور اعصاب سیاہ دخانات سے بھر جاتے ہین، نور عقل تاریک ہوجاتا ہے، خون مین زہر پیدا ہوجاتا ہے! دنیا تاریک نظر آنے لگتی ہے، اس تاریکی مین اس کو نیک و بد کی تمیز نہین رہتی، دوستی اور محبت کے پاک رشتے، قرابت اور رحم کے مقدس تار، عزت و حرمت کے قیمتی روابط ایک ہی ضرب مین پاش پاش کردئے جاتے ہین! تندخو کا دنیا مین کوئی دوست نہین، پاگل اور مجنون کا کوئی دوست کیسے ہوسکتا ہے، اسکی قسمت مین سوز و تپش لکھی ہوتی ہے، اسی سوز و غم کی وجہ سے وہ اطمینان قلب اور طمانیت خاطر سے محروم ہوتا ہے! اور جب قلب مطمئن نہ ہو تو بدن کیسے تندرست رہ سکتا ہے! اس جہان فانی مین شادمان زندگی کے گنج کے یہی دو اجزا تو ہیں، صحیح و تندرست بدن، اور مطمئن و آزاد دل، تندخو ان دونون سے محروم! اسکی سیاہ بختی و سیاہ روئی مین کسی کو شک کیسے ہو سکتا ہے، اب سوز و تپش، غم و ہم، رنج و حزن کے سوا اس کے ہان ذخیرہ کس چیز کا ہوتا ہے؟

سوز و تپش بقسمت ہر تندخو بود | برق از زبان حال مرا جستہ گفت

غرض غضب کا جذبہ ہر برائی کی کنجی ہے، (حضرت جعفر صادقؓ) بیوقوفی کی جڑ ہے، مسرت و شادمانی کا قاتل ہے، ایمان سوز ہے، اور طمانیت کش، اسی لئے جب بنی نوع انسان کے محسن اعظم آنحضرت صلعم (فداہ ابی و روحی) سے کسی نے درخواست کی کہ مجھے اپنی زندگی کو سنوارنے کے لئے ذرا سا عمل بتلا دیجئے، تو آپ نے فرمایا لاتغضب یعنی تو غصہ نہ کر، جب اس نے دوبارہ یہی سوال کیا تو یہی جواب دیا گیا، اور تیسرے مرتبہ کے سوال کا بھی یہی جواب ملا[۱]، کسی دوسرے موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ حق تعالیٰ کے نزدیک کسی گھونٹ کا پینا اس قدر محبوب نہین جس قدر کہ پی جانا غصہ کا[۲]، قرآن کریم نے "کَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ" کی تعریف کی ہے، اور ان کے اتباع کی تحریض و تاکید

۱؎ رواہ البخاری ۲؎ رواہ احمد،

کیا اس خونخوار جانستان جذبہ سے نجات ممکن ہے؟ علمائے نفسیات کا کیا خیال ہے؟ قرآن کریم نے کیا طریقے تعلیم کئے؟ کیا علم کی تصحیح عمل مین انقلاب پیدا کر سکتی ہے؟ کیا ریاضت و مجاہدہ غصہ کو محو کر سکتا ہے؟ انہی چند اعتبارات پر یہان بحث کرنی مقصود ہے، ع

ہشدار کہ رہ خود بخود گم نہ کنی؟

سقراط نے ایک ازلی صداقت کو اپنے ان الفاظ مین پیش کر دیا تھا، کہ "نیکی علم ہے"، یعنی علم صحیح ہی سے نیک عمل پیدا ہوتا ہے، بشرطیکہ علم زبان ہی کی حد تک محدود نہ رہا ہو، بلکہ قلب مین بھی اترا ہو، تیقن کے درجہ تک پہنچا ہو، جو شخص علم کو زبان ہی کی حد تک محدود رکھتا ہے، اسکو زبان سنت مین "علیم باللسان" اور "جاہل بالقلب" کہا گیا ہے، اس کا شمار ان واعظون مین ہوتا ہے، جن کی شکایت حافظ نے اپنی اس مخلو والذکر شعر مین کی ہے،

واعظان کین جلوہ بر محراب و منبر می کنند چون بخلوت می روند آن کار دیگر می کنند

علم صحیح بہر حال ضروری ہے، اور پھر اس کے مطابق عمل ہو تو فلاح انسان کے ہاتھ آتی ہے، جذبہ غضب کی تعدیل کے لئے بھی یہ دونون ضروری ہین، اس لئے ہم یہان ان ہی دو کے متعلق دو باتین عرض کرتے ہین،

(۱) علم صحیح: یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ انسان کسی چیز کو محبوب رکھتا ہے، اور کسی چیز کو مبغوض و مکروہ، وہ محبوب چیز کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے، اور اس کے تحفظ کا خواہان و متمنی ہوتا ہے، اور مکروہ شے سے بھاگتا ہے، اور اوس کو دفع کرنا چاہتا ہے، یہ اسکی فطرت ہے، وہ اسی پر مجبول ہوا ہے، جب اسکی مخالفت کیجاتی ہے، تو اس کو غصہ آتا ہے، بذات خود غصہ بُری چیز نہین، یہ مدافعت کا آلہ ہے، تحفظ حیات کے لئے ضروری ہے، استمرار نسل کے لئے ناگزیر ہے تنازع للبقا مین اس کا خاص مقام ہے، اس کے بغیر ارتقا مین نسل انسانی کا بقا ممکن نہ تھا، جس طرح

کائنات خارجی مین عنصر ناری ضروری ہے، اس کے عدم سے اختلال رونما ہوتا ہے، اسی طرح فطرت انسانی مین جذبہ غضب بھی ضروری ہے، اس کے فقدان سے تباہی پیدا ہوتی ہے، موت لازم آتی ہے، اب غضب کے تین درجے ہوتے ہین،

(۱) تفریط یعنی کمی، یہ بالاتفاق مذموم ہے، ایسے ہی آدمی کو بے غیرت کہا جاتا ہے، امام شافعی نے کہا تھا کہ جس شخص کو غصہ دلانے سے بھی غصہ نہ آئے وہ گدھا ہے، حمیت و غصہ کا بالکل نہ ہونا بھی سخت بُرا ہے، اگر کسی شخص کی بیوی اس کے ساتھ خیانت کرے، فحش کا ارتکاب کرے، اور وہ حلم سے کام لے تو بتاؤ کیا یہ عقلاً شرعاً و عرفاً سخت مذموم نہین؟ غصہ کا صحیح موقع پر استعمال ضروری ہے، حق تعالے نے صحابہ کرام کی صفت "اشداء علی الکفار" قرار دی، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ جاہد الکفار والمنافقین واغلظ علیهم ظاہر ہے کہ شدت و غلظت غضب کے بعد رونما ہوتی ہے، لہذا

قہر و لطف اندر محل خود نکوست جائے گل گل باش و جائے خار خار!

(۲) افراط یعنی زیادتی، یہ بھی بالاتفاق مذموم ہے، اسی سے نجات کے طریقون پر یہان غور کیا جا رہا ہے، جب غضب عقل و دین کی سیاست و قہرمانی سے نکل جاتا ہے، تو انسان درندہ بنجاتا ہے، آدمی تمام دنیوی و روحانی اقدار سے محروم ہو جاتا ہے، جنون کا تسلط اس کے دماغ پر ہو جاتا ہے، اہل غضب کی فہرست مین اس کا شمار ہونے لگتا ہے، جن کے متعلق یہ کتنا سچ ہوتا ہے کہ ع

سایۂ جن مین یہ انسان رہا کرتے ہین

(۳) اعتدال، یہ درجہ محمود ہے، یہان انسان کا غصہ عقل کے قہرمانی مین ہوتا ہے، دین کا مطیع ہوتا ہے، اس کے اشارہ کا منتظر ہوتا ہے، جہان حمیت شرعاً واجب ہوتی ہے، وہان وہ شدت سے کام لیتا ہے، اور جہان اس کا پی جانا ضروری ہوتا ہے، وہان وہ حد اعتدال سے نہین بڑھتا، اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے، جانتا ہے کہ ایسے موقع پر ع

ہر کرا حلم نیست او چو دُدست !

ظاہر ہے کہ ہم یہاں غضب کے استیصال کی تعلیم نہیں دیرہے ہیں، بلکہ اس کے اعتدال کی ہم غضب میں افراط و تفریط کو رفع کرکے وسط کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں کہ خیر الامور اوساطھا

دیکھو غصہ کا کوئی معروض ضرور ہوتا ہے یعنی اس کا تعلق کسی شے سے ہوتا ہے، اب اس معروض کی تین شکلیں ہوتی ہیں[1]

(۱) ایک وہ جو سب کے لئے ضروری اور لازمی ہے، جیسے غذا، لباس، مکان، صحت جب ان پر حملہ کیا جاتا ہے، تو شعلۂ غضب ان کے تحفظ کے لئے بھڑک اٹھتا ہے، حفاظت ذات و بقائے نسل کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہر جاندار اپنے دشمن کا مقابلہ کرے، اور ضروریات زندگی کے تحفظ میں شدت و قوت کا استعمال کرے، ورنہ وہ صفحۂ ہستی ہی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے گا، اور یہ فطرت کا مقصود نہیں، مجاہدہ اور ریاضت سے اس قسم کے غصہ کو محو کرنا ممکن نہیں، اور نہ ہی اسکی کوشش ہی کرنی چاہئے، کیونکہ یہ خلافِ فطرت ہے اور غیر اختیاری شے پر حکم اخلاقی لگایا نہیں جا سکتا، ہاں یہاں بھی حدِ اعتدال سے تجاوز ظلم و ستم ناروا ہے، اور بتکلف حلم و برداشت کرتے کرتے تحمل کی عادت پیدا کیجا سکتی ہے،

(۲) غصہ کے معروض کی دوسری قسم میں وہ اشیاء داخل ہیں، جو بعض کے لئے تو ضروری ہیں، اور بعض کے لئے غیر ضروری، جیسے صناع کے لئے آلات و اوزار اور عالم کے لئے کتابیں، اگر اگر ان محبوب اشیاء کو نقصان پہونچتا ہے، تو رنج ہوتا ہے، اور نقصان پہنچانے والے پر غصہ آتا ہے، اس قسم کے غصہ کا بھی بیخ و بن سے استیصال نہیں کیا جا سکتا، لیکن مجاہدہ سے غصہ کی شدت باطن میں باقی نہیں رہتی، اور صبر کی خو پیدا ہو سکتی ہے، اور سختی صبر کا احساس کم ہو سکتا ہے؛

[1] مقابلہ کرو احیاء العلوم باب غضب۔

(۳) غصہ کے معروضات کی تیسری قسم میں وہ اشیاء شامل ہیں، جو کسی کے لئے بھی ضروری نہیں، جیسے مال و جاہ، خدم و حشم، یہ عادۃً محبوب ہیں لیکن قطعاً داخل ضرورت نہیں یعنی ضروریات زندگی میں ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا، یہ "تعیشات محض" میں شامل ہوتے ہیں، جو غیظ و غضب ان کے متعلق سے پیدا ہوتا ہے، وہ ریاضت و مجاہدہ سے قطعاً قابلِ استیصال ہے، ہم یہاں جو کچھ عرض کر رہے ہیں، اس کا زیادہ تر تعلق اسی قسم سے پیدا ہوتا ہے،

جب ہم غصہ کی نفسیات پر غور کرکے یہ معلوم کر لیتے ہیں، کہ اس کا انبعاث محبوب اشیاء کے فقدان یا ضیاع سے ہوتا ہے، تو ہمیں ایک صداقتِ کلیہ کا صحیح وجدانی علم حاصل ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ غیظ و غضب کا اصل مبداء "حبِ اشیاء" ہے، جس طرح تمام حزن و ملال کا مبداء بھی یہی حبِ اشیاء ہے، نیز تمام حمق و جہالت کا بھی مبداء یہی ہے، دفع غضب کے لئے سچ پوچھو تو تبدیل مزاج کی ضرورت ہے، جیسا کہ عارفِ رومؒ نے فرمایا تھا، کہ انما التدبیر تبدیل المزاج اس تبدیلی کے لئے تنقیۂ دماغ ضروری ہے جس کا انحصار تزکیہ قلب پر ہے،

اس کے لئے چند قرآنی اور نفسیاتی حقائق پر تجرید ذہنی کے ساتھ غور کرو، تم مال و دولت کو جو تمھارے قبضہ میں ہے، اپنی ملک سمجھتے ہو، کیونکہ تم اس پر متصرف ہو، اپنی مرضی سے خرچ کرتے ہو، اپنی مرضی سے ذخیرہ کرتے ہو، اپنے مالک ہونے میں تمھیں کوئی شبہ نہیں ہوتا، ناگہاں تم بیمار ہو جاتے ہو، دولت تمھیں حالتِ صحت میں جان سے زیادہ عزیز تھی، لیکن جب درد کی شدت تمھیں بیقرار کرتی ہے تو مال تمھیں بار نظر آنے لگتا ہے، تم اضطرار کے ساتھ طبیب کو طلب کرتے ہو، علاج معالجہ پر بے دریغ خرچ کرتے ہو، اسی چیز سے مفارقت گوارا کرتے ہو، جو تم کو بہت زیادہ پیاری تھی! اب تمھیں معلوم ہوتا ہے کہ مال سے زیادہ محبوب شے صحت ہے، یعنی درد و الم سے رہائی، اور سکون و آرام کا حصول، لیکن باوجود تمھاری تمام سعی و کوشش کے تمھیں صحتِ بدنی اور راحتِ قلبی حاصل نہیں

ہوتی، تمھارے طبیب کا نسخہ اثر نہیں دکھلاتا، طبیب کے ابلہ ہونے کا تم کو یقین ہوجاتا ہے، اور تمھیں خوف ہوتا ہے کہ یہ کہیں اجل کی پیشقدمی کی علامت نہ ہو، اس سے زیادہ قابلِ طبیب تمھارے علاج میں مصروف ہوتے ہیں، تیر بہدف نسخون کا استعمال ہوتا ہے، لیکن تمھارا درد بڑھتا جاتا ہے، اضطرا و اضطراب میں ترقی ہوتی ہے، تمھارا مال تمھاری جاہ و حشمت تمھارے خادم و نوکر اپنے تمام ذرائع کا تم استعمال کررہے ہو، لیکن ان سے تمھیں کوئی فائدہ کوئی نفع حاصل نہیں ہورہا ہے، تم اپنی تکلیف ا در دمیں کسی قسم کی کمی نہیں پاتے، اب تمھیں یاد پڑتا ہے کہ تم نے کہیں پڑھا تھا، یا کسی سے سنا تھا کہ قُل لَا اَملِکُ لِنَفسِی ضَرًّا وَّلَا نَفعًا وَلَا مَوتًا وَّلَا حَیَاۃً وَّلَا نُشُورًا" الفاظ تمھارے ذہن میں تھے، معنی کا تمھیں کھلا فہم حاصل نہ تھا، وجدان میں ان کا تحقق نہ ہوا تھا، ان کے مصداق سے بے خبر تھے، اب شاید تمھیں پہلی دفعہ روشنی نظر آرہی ہے، جہل کی ظلمت دور ہورہی ہے، اپنی ہی ذات میں معنی کا تحقق ہورہا ہے، اور خود کو نہ نفع پر قادر پارہے ہو اور نہ ضرر کے دفع کی قوت ہی کا تمھیں احساس ہورہا ہے، پھر تم مالک کس شے کے ہو؟ تمھاری مالکیت سے تمھیں کیا فائدہ؟ اپنی محبوب ترین جان سے تکلیف کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے، درد کی شدت میں رتی بھر کمی نہیں کرسکتے، مال تمھیں اسلئے محبوب تھا، کہ اس سے درد کا ازالہ ہوتا ہی، راحت حاصل ہوتی ہے، پھر یہ کیا ماجرا ہے، اسکا اثر کہان گیا؟ جب مال کے اثرات تمھارے اختیار میں نہیں تو ایسے بے اثر مال کو لیکر کیا کروگے؟ یہ تو محض ایک بارِ گران ہے، اس سے تو کمر ٹوٹتی ہے، یہ پھر اتنا عزیز اتنا محبوب کیون ہو؟ سچ پوچھو تو یہ تمھاری ملک بھی نہیں، یہ حق تعالیٰ کی ملک ہے وَلِلّٰہِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ (پ ۲۸ ع ۱۳) اور وہی اس کے حقیقی مالک ہیں: لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الاَرضِ وَمَا بَینَہُمَا (پ ع) یہ تمھارا مغالطہ تھا کہ تم اس کو اپنی ملک سمجھ رہے تھے، اور اپنے کو اس کا مالک جان رہے تھے، سچ پوچھو تو تمھاری کوئی چیز ہی نہیں، تم اپنی ذات کے لحاظ سے فقیر محض ہو، اور حق تعالیٰ ہی غنی و حمید ہیں

"یٰاَیُّہَا النَّاسُ اَنتُمُ الفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ہُوَ الغَنِیُّ الحَمِیدُ" (پ ۲۲ ع ۱۴) حق تعالیٰ نے اپنی عنایت و رحمت سے تمھیں دولت دی، عزت دی، مال و دولت تمھارے پاس امانت ہیں، تم امین ہو اس سے زیادہ نہیں، مالک و حاکم حق تعالیٰ ہیں، تمھیں حقِ امانت کا احساس ہونا چاہئے، استردادِ امانت کا جب وقت آئے تو تمھیں خوشی کیساتھ اسکو مالکِ حقیقی کے سپرد کردینا چاہئے، جانتے ہو استرداد امانت کے مواقع کونسے ہیں؟ ان کی تفصیل کا یہ وقت نہیں، لیکن اتنا یاد رکھو کہ جب تمھاری دولت پر آفت آتی ہے، وہ تمھارے ہاتھون سے چھین لیجاتی ہے، اور تم اس کو بچا نہیں سکتے، اور تمھارے قلب کے تار ٹوٹے جاتے ہیں، تمھیں احساس ہوتا ہے، کہ تم اپنی ملک سے محروم ہورہے ہو تو تمھاری نارِ غضب بھڑک اٹھتی ہے، یہی وقت اس علمِ صحیح کے تحضر کا ہے، کہ تم محض امین ہو، مالک نہیں، مالکِ حقیقی استردادِ امانت چاہ رہا ہے، متاعِ غیر پر تمھارا اختیار نہیں، تمھارا فریضہ ہے، کہ تشکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ امانت کو حوالہ کردو، غیظ و غضب کا کوئی موقع نہیں، بلکہ خوشی کا مقام ہے، دیانت دار امانت کے استرداد کے وقت ضیق محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس کے قلب کو سرور و مسرت ہوتی ہے، کہ اس نے اتنا عرصہ امانت کی حفاظت کی، شرائطِ مقررہ کے تحت اس پر متصرف رہا، اور بالآخر وقتِ مقررہ پر مالکِ حقیقی کے ہاتھ امانت سپرد کررہا ہے!

ہان کیا تم جانتے ہو کہ تم پر ان بلیات کا نزول کیون ہے؟ تمھارا مال تمھاری دولت آفتون کا نشانہ کیون بن رہی ہے، اور تم غیظ و غضب کی آگ میں کیون جل رہے ہو؟ کیا اس کا بڑا سبب یہی خیانت فی الامانۃ تو نہیں؟ جہان تم نے اپنے علم کی تصحیح کی، اپنے کو امین جانا، اور امانت کے تصرف میں خیانت کو ترک کیا، اور شرائطِ معینہ کا خیال رکھا، کہ فوراً تمھارے قلب کی حفاظت کردیجاتی ہے، اب وہ غصہ کی آگ سے محفوظ ہوجاتا ہے، اپنے فقر و امانت کا علم ہوجانے کے بعد وہ اپنی حاجت کے وہم سے بھی نکل آتا ہے، حاکمِ حقیقی وہ حق تعالیٰ ہی کو جاننے لگتا ہے، اِنِ الحُکمُ اِلَّا لِلّٰہِ کا اس کو

یقین پیدا ہو جاتا ہے، اپنے حکم کی خلاف ورزی پر اسکو آگ نہین لگتی، اس کا شعلۂ غضب نہین بھڑک اٹھتا، حُبِ جاہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر جذبۂ غضب کا بھی استیصال ہو جاتا ہے، اگر مجھ پر وجدان مین یہ بات کھل جائے، کہ میری ذات فقر محض ہے، مالک نہین مملوک ہے، حاکم نہین محکوم ہے، رب نہین مربوب ہے، مولی نہین عبد ہے، ہان اگر اس حقیقت کا محض تعقلی علم نہین وجدانی تحقق ہو جائے تو اب میری نظر مین غضب کے سارے معروضات فنا ہو جاتے ہین، مال وجاہ خدم وحشم کا تعلق میری ذات سے باقی نہین رہتا، فقیر کو ان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ تو اس ذات کے لوازمات ہین، جو غنی وحمید ہے، جو مولی و رب ہے، جو مالک وحاکم ہے!

حق تعالی ہی الٰہ ہین، لا الہ الا اللہ وہی معبود ہین، اور مستعان اور ہم سب عبد، عبد اپنی ماہیت ہی کے لحاظ سے ذلیل ہے، اور فقیر، اس کی یہ نسبت ذل وافتقار حق تعالی ہی سے ہے کسی غیر سے نہین، وہ غیر اللہ کی نسبت سے غنی ہے، اور حق تعالی کی نسبت سے فقیر، غنی کا فقیر سارے عالم سے مستغنی ہوتا ہے، جب قلب مومن پر اس توحید کا غلبہ ہو جاتا ہے، تو وہ ساری دنیا سے اور دنیا کی تمام محبوب ومرغوب چیزون کی محبت سے آزاد ہو جاتا ہے،

رفت آنکہ بقبلۂ بتان رو آرم — حرفِ غم شان بہ لوح دل ننگارم
آہنگِ جمال جاودانی دارم — حسنے کہ نہ جاودان ازو بیزارم

(جامی)

اور تم اوپر دیکھ چکے ہو، کہ غیظ وغضب کی اصل ومنشا حُب اشیا رفانیہ ہے، لا الہ الا اللہ سے قلب کا تزکیہ اور روح کا تجلیہ ہوا کہ حب اشیا رفنا ہوئی، اور اس حُب کے فنا ہوتے ہی غضب کی بھی بیخ کنی ہو گئی!

(۲) مجاھدہ: اس علم صحیح کے حصول کے بعد اب تمھین مجاہدہ کی طرف توجہ کرنی چاہئے

مجاہدہ علم کے قلب مین نفوذ وسریان کے لئے ضروری ہے، مجاہدہ سے علم کا استقرار ہوتا ہے، تلوین جاتی ہے، تمکین پیدا ہوتی ہے، مجاہدہ ہدایت کے راستون کو کھولتا ہے، حصول مقصود کا یہی واحد ذریعہ ہے، تمھارے سامنے جو علم صحیح اوپر پیش کیا گیا ہے، اس پر تدبر ضروری ہے، تفکر لازمی ہے، فجر کا وقت اسکے لئے سب سے زیادہ موزون ہے، اس وقت اعصاب رات کی استراحت کی وجہ سے تازہ دم ہوتے ہین، قلب کو سکون ہوتا ہے، دماغ افکار دنیوی سے نسبتہً خالی ہوتا ہے، ایسے وقت تمھین زندگی کے کاروبار شروع کرنے سے پہلے اس ازلی وابدی صداقت پر غور کرنا چاہئے، اسکو قلب کی گہرائیون مین اتارنے کی کوشش کرنی چاہئے، اپنے تحت الشعور نفس تک پہنچانے کی سعی کرنی چاہئے، کہ مالک، حاکم حق تعالی ہین، حکم ان ہی کا چلتا ہے، ہر چیز ان ہی کی ملک ہے، وہی رب ہین اور وہی مولی، ہم انھی کے فقیر ہین انھی کے در کے سائل ہین وہی ہمارے معبود ہین، وہی مطلوب، وہی محبوب وہی مقصود، ان کو چھوڑ کر مین کسی چیز کا محتاج نہین، مین "غنی عن الشئ" ہون، ہر شے سے برتر، مجھ ہی سے ارشاد ہوا ہے،

لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا — تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے، تم اس پر
بما آتاکم، — رنج نہ کرو، اور جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے،
(پ ۲۷، ع ۱۹) — اس پر اتراؤ نہین،

کیونکہ ؎ عالم بطفیلِ ماست موجود — مائیم ز کائنات مقصود!

جون جون تمھارا مراقبہ، تمھارا تفکر وتدبر عمیق ہوتا جائے گا، تمھارا نقطۂ نظر بدلتا جائے گا اور یاد رکھو کہ نقطۂ نظر ہی کے بدلنے سے خودی مین انقلاب پیدا ہوتا ہے، اور خودی کے انقلاب سے کائنات کے چارسو بدل جاتے ہین، ؎

تری خودی مین اگر انقلاب ہو پیدا — عجب نہین ہے کہ یہ چارسو بدل جائے

اسی انقلاب مزاج سے تمھارے قلب سے اشیاء فانیہ کی محبت محو ہوتی ہے، اور غصہ

کا مبناہی مسمار ہو جاتا ہے، جب تک تم نے اپنے کو مالک و حاکم جانا، امانت مین تم نے خیانت کی مین
نہین غاصب ٹھہرے، غاصب کو جہان کہان امن وچین لینے دیتا ہے، تم مین اور کائنات مین توافق
نہین تخالف و تنازع قائم ہوگیا، اب ہر واقعہ تمھارے غضب کو بھڑکائے گا، اور تمھارے لئے سوہان روح
کا باعث ہوگا، جب تم نے اپنا نقطۂ نظر بدلا، حق تعالیٰ کو مالک و حاکم جانا اور خود کو ان کا مملوک و محکوم ادائے
کر واقف ہو گئے تو اب کائنات مین اور تم مین توافق پیدا ہو جائیگا اس توافق کے بعد انبعاث غضب کا کوئی موقع نہین ہو سکتا

تسلیم نمی شوی از ان غم گینی تسلیم شو ہر آنچہ آید پیش!

اس لئے تمھین دوران تفکر مین رضا بالقضا کے اعتبارات پر خاص طور پر توجہ کرنی چاہئے، دیکھو
مدبر امور درحقیقت کون ہین، حق تعالیٰ ہین، یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ، جب
وہ مدبر ہین، جب امر و حکم ان ہی کا چل رہا ہے، تو ان کی تدبیر کے ساتھ حسن رضا درکار ہے، نہ کہ
غصہ و غضب! دیکھو، حق تعالیٰ کی ذات کامل، ان کے صفات کامل، ان کے افعال کامل، اور خود
ہی خالق، (خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ) تو اب بات تمھارے ذہن مین جم جانی چاہئے، کہ

ع ہرچہ از دوست می رسد نیکو است

دیکھو حق تعالیٰ مومن پر رحیم ہین، "کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا" اب اگر تم مین ایمان ہے، اسکی حفاظت
تم نے کر لی ہے، تو اب ہر واقعہ تمھارے لئے بشان رحمت ہی پیش آئے گا، گو بصورت قہر کیون
نظر آئے کیونکہ حق تعالیٰ تم پر رحیم ہو کر تمھارا نقصان روا نہین رکھتے، جب اس صداقت پر
تم غور کروگے، اور تمھارے قلب پر وہ مسلط ہو جائیگی، تو بے اختیار تمھاری زبان سے یہ پر ترنم الفاظ
نکلنے لگین گے، :

خواہی ز وصال شادمان دار مرا خواہی ز فراق بہ فغان دار مرا
من با تو نگویم کہ چنان دار مرا زان سان کہ دلت خواست چنان دار مرا (خیام)

یہ مجاہدہ کا انجام ہوگا، لیکن اس غایت کا حصول یکدم نہین ہوتا، تمھین اپنے کام مین لگے رہنا چاہئے
اور ہمت و استقلال سے قدم بڑھائے جانا چاہئے، کامیابی بالآخر مجاہد کے ہاتھ چومتی ہی، اور کَانَ
حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ کا وعدہ اسکے لئے پورا ہو کر رہتا ہے!

اندرین رہ می تراش و می خراش تا دم آخر دمے فارغ مباش
دوست دارد دوست این آشفتگی کوشش بیہودہ بہ از خفتگی
کار کن کن تو وکاہل مباش!! اندک اندک خاک چہ را می تراش
چون ز چاہے می کنی ہر روز خاک عاقبت اندر رسی در آب پاک
چون نشینی بر سر کوے کسے عاقبت بینی تو ہم روے کسے

تلخیص تبصرہ

حبشہ مین مسلمانون کی تاریخ

حبشہ اور عرب کے درمیان جغرافی اور طبعی مختلف حیثیتون سے بڑی مشابہت ہے، دونون ہم جوار ہین، دونون مین بہت قدیم زمانہ سے علاقہ چلا آرہا ہے، ظہورِ اسلام سے کئی صدی پیشتر یمن کے بعض قبائل ہجرت کرکے حبشہ مین آباد ہوگئے تھے، اور اپنے ساتھ ایک اعلیٰ تہذیب ایک بلند اجتماعی نظام اور ایک مستقل زبان لائے تھے، جس کا حبشہ کی ترقی مین بڑا حصہ ہے، یہ لوگ اپنے کو جعز یعنی آزاد کہتے تھے، حبشہ آنے کے تھوڑے ہی دنون کے بعد انھون نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا، ان کی زبان اب مٹ چکی ہے، لیکن اسکی اعلیٰ ادبی یادگارین ابتک باقی ہین، اس کے علاوہ عرب اور حبشہ کے درمیان تجارتی تعلقات بھی بہت قدیم زمانے سے ہین، اس سلسلہ مین جنوبی عرب اور مکہ مین ان کی آمد و رفت رہتی تھی، اور ان مقامون پر ان کی بڑی تعداد ہوگئی تھی، ظہورِ اسلام کے بعد ان تعلقات مین اور زیادہ اضافہ ہوا، ستم رسیدہ مسلمانون کے پہلے مہاجر قافلہ نے حبشہ ہی مین پناہ لی تھی، اور نجاشی نے ان کی جس طرح پذیرائی کی تھی، اور اس سلسلہ مین جو واقعات پیش آئے ان کی تاریخ محفوظ ہے، اس سے حبشہ اور مسلمانون کے درمیان نہ صرف تعلقات بلکہ روابطِ محبت قائم ہوگئے، جس کا اثر ہمیشہ باقی رہا،

لیکن اسلام کی اشاعت کا آغاز حبشہ مین چوتھی صدی ہجری سے شروع ہوا، سب سے اول ایک عرب مبلغ شیخ ابادیر نے حبشہ کے شہر ہرر مین تبلیغِ اسلام کا آغاز کیا، اور اسکی کوششون

سے یہان کے بہت سے باشندون نے اسلام قبول کیا، اور ہرر تبلیغِ اسلام کا مرکز بن گیا، اور حبشہ مین آہستہ آہستہ اسلام پھیلتا رہا، اور آٹھوین صدی ہجری مین نصف مشرقی حصہ مین مسلمانون کی حکومت قائم ہوگئی، اس کے ایک فرمانروا ایفات (؟) نے انکوبر کو جو ادیس ابابا سے ۵۰ کیلومیٹر کی مسافت پر شمال مشرق مین واقع ہے، اپنا پایۂ تخت بنایا، ایفات مکہ کے ایک معزز خاندان سے تھا، اس خاندان کا اثر و نفوذ اتنا بڑھا، کہ ۸۰۰ھ مین قریب تھا کہ پورا حبشہ اس کے قبضہ مین آجائے نجاشی بڑی مشکلون سے ایک عرصہ کے بعد اپنا زائل شدہ اثر قائم کرسکا، اور مدتون کی کشمکش کے بعد دونون مین دوستانہ روابط کا آغاز ہوا، اس زمانہ مین حبشہ کے مسلمانون اور عیسائیون دونون کی حالت پست تھی، چنانچہ اپنی اصلاح و ترقی کے لئے انھون نے مصر کی طرف رجوع کیا، نجاشی نے حبشہ کی اصلاح و ترقی کے لئے قبطی علما، اور اربابِ کمال کو حبشہ بلایا، اور مسلمانون نے اپنے لڑکون کو تعلیم کے لئے مصر بھیجنا شروع کیا، گو ان کوششون سے ان کی عام تعلیمی ترقی پر کوئی خاص اثر نہین پڑا، پھر بھی ان مین بعض بڑے بڑے علما پیدا ہوئے، بعض عربی مصنفین کے نام کے ساتھ "جبرتی" کا جو لفظ آتا ہے، یہ وہی حبشی مسلمان ہین،

۹۳۲ھ مین ایک صومالی مسلمان احمد جران نے شمالی حبشہ پر حملہ کیا، لیکن فاش شکست کھائی، اس سلسلہ مین یہ امر خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، کہ اس سے حبشہ کے عیسائیون اور مسلمانون کے تعلقات مین کوئی فرق نہین پیدا ہوا، اور اس زمانہ مین بھی دونون کے دوستانہ تعلقات بدستور قائم رہے، اور اسلام آہستہ آہستہ پھیلتا رہا،

۱۰۵۷ھ مین امام یمن نے ایک وفد حبشہ بھیجا، اس نے دیکھا، کہ جیبوٹی سے لیکر جندر تک جو اس زمانہ مین حبشہ کا پایۂ تخت تھا، ہر جگہ مسلمان آباد ہین، اور بڑے عیش اور سکون کی زندگی بسر کررہے ہین، خود پایۂ تخت مین مسلمانون کی کافی تعداد ہے اور حکومت کے اعلیٰ عہدون

پر بھی وہ ممتاز ہین اس زمانہ سے حبشہ مین اسلام کی اشاعت کی رفتار تیز ہو گئی، اور گیارہوین صدی سے اجالا کے قبائل مین اسلام پھیلنا شروع ہوا، اور تیرہوین صدی مین شمالی حبشہ کے علاقے تجرہ کا بڑا حصہ جو عیسائی تھا مسلمان ہو گیا،

حبشہ کی صحیح اور قابل اعتماد مردم شماری نہین معلوم لیکن عام طور سے مشہور ہے کہ وہان بچاس لاکھ عیسائی، چالیس لاکھ مسلمان اور تیس لاکھ بت پرست آباد ہین، اور بت پرستون کی بڑی تعداد اسلام کی طرف مائل ہے، ممکن ہے، یہ اعداد و شمار پورے طور سے صحیح نہ ہون لیکن تینون طبقون کی آبادی کا تناسب بالکل صحیح ہے، آرٹریا کی دو تہائی اور برطانوی صومال کی پوری آبادی مسلمان ہے،

حبشہ کے مسلمان بڑے راسخ العقیدہ اور مذہبی معاملات مین بڑے غیور اور خوددار ہین، لیکن انکی تعلیمی حالت دوسرے ملکون کے مسلمانون سے گری ہوئی ہے، ان مین عربی بہت کم جانتے ہین، ان کی زبان امہری ہے، جس کو وہ عربی رسم الخط مین لکھتے ہین، کلام اللہ کے بعض پارون کا ترجمہ بھی انھون نے اس زبان مین کیا ہے، شہرون کے اکثر مسلمان اپنے بچون کو مذہب کے مبادیات کی تعلیم دیتے ہین لیکن مساجد و مدارس مین اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہین ہے، اور اس کے لئے انھین قاہرہ جانا پڑتا ہے، لیکن ادھر چند برسون سے کسی قدر حالت بہتر ہو رہی ہے، بڑے بڑے شہرون مین مدارس بھی قائم ہو گئے ہین اور مسلمان نوجوانون کی انجمنین بھی حبشہ کے بادشاہ تھیوڈر کے زمانہ تک حکومت اور مسلمانون کے درمیان کشمکش تھی، لیکن حبشہ اور مصر کی جنگ کے خاتمہ ۱۲۹۰ھ کے بعد حالت بدلنے لگی، اور منلیک اور ہیلا سلاسی نے خاص طور سے مسلمانون کی اہمیت کو محسوس کیا، اور حکومت کے نظام مین ان کے حقوق کا پورا لحاظ رکھا، اس لئے اب دونون کے تعلقات خوشگوار ہین،

۱۳۵۰ھ مین ہیلا سلاسی نے مسلمانون کو حکومت کی اعانت پر آمادہ کرنے کے لئے علماء کو قبائل

مین حکومت کے اغراض و مقاصد سمجھانے کے لئے بھیجا، اور مساجد کی تعمیر اور مدارس کے قیام کے لئے بڑی بڑی رقمین دین، اور مسلمان قاضیون کو مسلمانون کے جملہ دینی امور مین فیصلہ کے اختیارات عطا کئے، حبشہ پر اٹلی کے حملہ کے زمانہ مین اٹلی نے حبشہ کے مسلمانون کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے لئے بڑی کوششین کین، اور ان سے بڑے بڑے وعدے کئے، لیکن اس نے لیبیا کے مسلمانون کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، وہ حبشہ کے مسلمانون کی نگاہ کے سامنے تھا، اس لئے وہ اس کے دام مین نہ آئے اور ہیلا سلاسی کی وفاداری پر قائم رہے، اور امام یحییٰ کے نمایندہ کی مدد سے شیخ عمر ازہری کی صدارت مین جمعیۃ اسلامیہ قائم کر کے پورے اخلاص و وفاداری کے ساتھ اپنے وطن کی خدمت مین حصہ لیا، حبش کے قافلون نے جن مین زیادہ عرب تھے، اٹلی کے مقابلہ مین جانورون اور مویشیون سے حکومت کی مدد کی اور نہ صرف حبشہ بلکہ دنیاے اسلام کے مختلف حصون کے مسلمانون نے حبشہ کا ساتھ دیا اور مصر و شام کے بہت سے مسلمان آکر حبشہ کی فوج مین داخل ہوئے، لیکن اٹلی کے وحشیانہ حملہ نے ان ساری کوششون کو خاک مین ملا دیا، اور حبشہ اپنے عیسائیون اور مسلمانون سمیت اٹلی کا غلام بن گیا تا آنکہ پانچ سال بعد برطانیہ کی فوجون نے پھر اٹلی سے آزاد کرایا، اٹلی کے قبضہ کے زمانہ مین حبشہ کے مسلمانون اور عیسائیون پر جو مشترک مظالم ٹوٹے انھون نے ان کو اور زیادہ متحد کر دیا، اور امید ہے کہ جدید حبشہ کی تعمیر مین دونون کا برابر کا حصہ ہوگا،

"م"

افادات مہدی

ملک کے نامور انشا پرداز ایم مہدی حسن مرحوم کے ۳۰ مضامین کا مجموعہ جس کو درحقیقت اردو زبان کا سرمایۂ ادب و انشا کہنا چاہئے،   قیمت ے ر، ۳۷۵ صفحے،

"منیجر"